Phone: 7500

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوع اسلام

مارچ 1962ء

* *

آبروئے ما ز نام مصطفیٰ است

ایک نہایت اہم سوال۔

اندر لمعات میں دیکھئے

* *

شائع کردہ:

ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت ۷۵ پیسے

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوع اسلام لاہور

بدل اشتراک
ہندو پاکستان سے سالانہ آٹھ روپے
غیر ممالک سے سالانہ ۱۲ شلنگ

قیمت فی پرچہ
ہندو پاکستان سے
۷۵ نئے پیسے

ٹیلیفون نمبر ۵۰۰ ۷
خط و کتابت کا پتہ:- ناظم ادارہ طلوع اسلام
۲۵- بی گلبرگ - لاہور

جلد ۱۵ | مارچ ۱۹۶۲ء | نمبر ۳

فہرست مضامین

لمعات ــــــــ ۲
پرویز صاحب کا مکتوب مفتی محمد شفیع صاحب کے نام ــــــــ ۷
حضرت مسیحؑ کی انقلاب آفریں تعلیم ــــــــ ۱۰
حقائق و عبر ــــــــ ۱۴
رابطۂ باہمی ــــــــ ۱۹
نقد و نظر ــــــــ ۲۵
باب المراسلات (قدیم و جدید کی کشمکش - قرآن کی سائنٹیفک تعبیر - قوانین فطرت اور انسانی معاشرہ) ــــــــ ۳۵
احتساب ــــــــ ۴۱
سرسید کے زمانے میں مسلمانوں کی حالت (محترم شاہد حسین رزاقی) ــــــــ ۵۵
اسلام پر مختلف ثقافتوں کے اثرات ــــ علامہ احمد امین مصری) ــــــــ ۶۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لمعات

آبروئے ما ز نام مصطفیٰؐ است

موقر جریدہ "ڈان" (اور اس کے بعد دیگر جرائد جنہوں نے اس سلسلہ میں کچھ لکھا ہے) ملت اسلامیہ کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے قوم کی توجہ ایک ایسے خطرہ کی طرف مبذول کرائی ہے جو اگر (خدانخواستہ) معرض وجود میں آگیا تو اس کے نتائج ایسے ہولناک، روح فرسا اور قیامت خیز ہوں گے جن کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے، اور جو دنیا کے طول و عرض میں بسنے والے کروڑوں مسلمانوں کے دل کو وقف اضطراب کر دیں گے۔ وہ خبر جسے ہم دل پہ پتھر رکھ کر شائع کرنے کی ہمت کر رہے ہیں (معاصر نوائے وقت) کے الفاظ میں یہ ہے کہ

> اٹلی اور امریکہ کی دو فلم کمپنیاں آنحضرت، پیغمبر اسلام (صلعم) کی زندگی کو فلمانے کی تیاریاں کر رہی ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ فرانس میں ایران کے سابق سفیر مسٹر زین العابدین کی کتاب "پیغمبر اعظم محمدؐ" کی روشنی میں فلم تیار ہوگی۔ امریکہ میں عرب جمہوریہ کے سفیر ڈاکٹر مصطفیٰؐ نے اس تجویز کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا ہے کہ اسلامی ملکوں کو فلم کی تیاری میں تعاون کرنا چاہیئے۔ فلم بندی کی نگرانی عرب لیگ کے ارکان کریں گے۔ پتہ چلا ہے کہ اٹلی کی فلم کمپنی نے اس سلسلہ میں عرب ملکوں سے بات چیت شروع کر دی ہے۔ اس کمپنی نے یہ شرط رکھی ہے کہ آنحضرت صلعم کی زندگی پر فلم بندی میں ایران کی سابقہ ملکہ ثریا ایک خاص رول ادا کریں گی۔ عرب لیگ کی جانب سے فلم کی تیاری کا معاملہ جامعہ ازہر مصر کے علماء کے سامنے

پیش کر دیا گیا ہے کہ حضور (صلعم) کے صرف پاءے مبارک فلم میں دکھائے جائیں گے۔

(نوائے وقت ۲۴-۱۰)

جہاں تک غیر مسلموں کا تعلق ہے، وہ اس کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتے کہ ہم مسلمانوں کے نزدیک حضور ختمی مرتبتؐ (فداہ ابی وامی) نبی اکرم (صلعم) کے شرف و مجد کا مقام بلند و بالا کیا ہے، اور ہمارے قلوب میں اس ذاتِ گرامیؐ کی عظمت و رفعت اور احترام و عزت کس شدت کی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ دیگر اقوامِ عالم اپنے اپنے بانیانِ مذاہب کی عزت کرتی ہیں۔۔۔ حتیٰ کہ ان میں سے اکثر ان کی پرستش تک بھی کرتی ہیں۔۔۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ جانتی ہی نہیں کہ ایک نبی کا صحیح مقام کیا ہوتا ہے اور وہ کس طرح اپنے متبعین کی زندگی کا جزو بن چکا ہوتا ہے، جزو زندگی ہی نہیں بلکہ زندگی سے بھی زیادہ عزیز۔۔۔۔ ماں۔ باپ۔ بہن بھائی۔ اعزہ واقارب۔ مال و دولت۔ غرضیکہ دنیا کے حبیب سے حبیب تر رشتہ، اور عزیز سے عزیز تر متاع سے کہیں زیادہ حبیب اور عزیز۔۔۔ اور یہ چیز کسی فرد کے ذاتی جذبات کی نہیں بلکہ قرآن کریم کی رو سے مومن ہونے کی شرط ہے کیونکہ اس کا ارشاد ہے کہ اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ (۳۳/۶) "مومنین کو نبی سے، اپنی جان سے بھی زیادہ لگاؤ ہے اور اس کی بیویاں ان کی مائیں ہیں"

دنیا کی قریب قریب ہر قوم نے اپنے بانیٔ مذہب کو تصویر کے پیکر یا مجسموں کی شکل میں اپنے سامنے رکھا ہے، اور یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ جب بھی کسی عظیم شخصیت کو تصویر یا مجسمہ کی شکل میں سامنے رکھ لیا جائے، وہ اپنے ارفع و اعلیٰ مقام سے نیچے آجاتی ہے اور اس کے متعلق دلوں میں وہ احترام باقی نہیں رہتا جو اس کی بلندیٔ سیرت اور حسنِ کردار کے تصور سے وجہ نورانیٔ قلب و نگاہ بنتا ہے۔ یہ لامحدود احترام، محسوس پیکروں میں آکر محدود ہو جاتا ہے۔ ان قوموں کے مصور اور مجسمہ ساز کوشش کرتے رہتے ہیں کہ وہ اپنے بزرگوں کی تصاویر یا مجسموں کو زیادہ سے زیادہ حسین یا مقدس بنا کر پیش کریں لیکن ظاہر ہے کہ یہ حسن اور تقدس محض جسمانی ہو سکتا ہے۔ ان کی وہ عظیم ذات (personality) جس کی وجہ سے انہیں وہ مقام بلند حاصل ہوا تھا، اس کی نمود کسی صورت میں بھی، تصویر یا مجسمہ کے ذریعے نہیں ہو سکتی۔ اس باب میں حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی منفرد حیثیت کی مالک ہے کہ حضورؐ کی عظمت محسوس پیکروں میں محبوس ہو کر محدود نہیں ہوئی۔ وہ اپنی لامتناہیت کے ساتھ، ہر قلبِ مومن میں بحرِ ذخار کی طرح موجزن ہے۔ مذکورہ فلم کمپنیوں کی زیرِ نظر تجویز، حضورؐ کی اس بلند و بالا منفرد حیثیت اور خصوصیتِ کبریٰ کو

---

[1] یہودیوں نے غالباً اپنے نبیوں کے مجسمے نہیں بنائے۔ لیکن ان کی مقدس کتابوں میں انبیائے بنی اسرائیلؑ کی تصویر جن الفاظ میں پیش کی گئی ہے ان سے ظاہر ہے کہ ان کے دلوں میں ان کا کس قدر احترام ہے!

(معاذ اللہ) الگ کر کے آپؐ کو اسی مقام پر لے آنے کے مرادف ہو گی جس مقام پر دیگر اقوام اپنے اپنے بانیانِ مذاہب یا دیگر بزرگ شخصیتوں کو لا چکی ہیں۔

اور مسلمان اسے ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتے۔

ہم تو اسے بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ دیگر انبیائے کرامؑ کے مجسمے تراشے جاتے یا ان کی فلمیں بنائی جاتیں۔۔۔ اس لئے کہ ان کی نبوت کا تسلیم کرنا ہمارے لئے جزوِ ایمان ہے۔۔۔ لیکن ان کے ضمن میں ہماری پوزیشن ثانوی رہ جاتی ہے۔ مثلاً اگر ہم عیسائیوں سے کہیں کہ وہ حضرت عیسٰیؑ کا مجسمہ نہ تراشیں یا ان کی زندگی کی فلم نہ بنائیں، تو وہ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت عیسٰیؑ ہمارے پیغمبر (یا اس سے بھی زیادہ کچھ اور ہیں)۔ ہم جس شکل میں جی چاہے انہیں اپنے سامنے رکھیں یا دنیا کے سامنے پیش کریں۔ آپ اس میں دخل دینے والے کون ہیں۔ تو اس جواب سے ہماری پوزیشن کمزور ہو جاتی ہے۔ لیکن حضور ختمی مرتبت، نبی اکرمؐ کے سلسلہ میں ہماری پوزیشن یہ نہیں۔ اس باب میں حرفِ آخر مسلمانوں کا ہو گا۔ کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔

اب ہم اس تجویز کے اس حصے تک آ پہنچے ہیں جہاں اس کے ساتھ بعض مسلمان افراد اور مسلمان اداروں کا نام بھی چسپاں ہے۔ یعنی یہ کہ عرب جمہوریہ کے سفیر، ڈاکٹر مصطفٰے نے اس تجویز کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا ہے کہ اسلامی ملکوں کو فلم کی تیاری میں تعاون کرنا چاہیئے۔ یا یہ کہ فلم کی نگرانی عرب لیگ کے ارکان کریں گے۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ خبر کا یہ حصہ کس حد تک درست ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے تحقیق کر لی جائے کہ اس میں کہاں تک صداقت ہے۔ اگر یہ خبر درست ثابت ہو (اور خدا کرے کہ ایسا نہ ہو) تو پھر اس امر کی ضرورت ہو گی کہ ان افراد یا اداروں کو، دلائل و براہین کی رو سے سمجھانے کی کوشش کی جائے کہ اس باب میں ان کا موقف کس قدر غلط ہے۔ یہ اس لئے کہ سر دست ایسا باور کرنے کی ہمارے پاس کوئی وجہ نہیں کہ انہوں نے شرارت کے طور پر یا کسی ذاتی مفاد کے پیشِ نظر ایسا کیا ہو۔ ہو سکتا ہے (اور جب تک اس کے خلاف ثبوت نہ مل جائے ہمیں اس قسم کا ظن رکھنا چاہیئے) کہ وہ نیک نیتی سے اس غلط نتیجہ پر پہنچے ہوں، اور اگر انہیں علم و بصیرت کی رو سے بات سمجھائی جائے تو وہ اپنا خیال بدل لیں۔

تجویز میں کہا گیا ہے کہ فلم میں حضورؐ کے صرف پائے اقدس دکھائے جائیں گے۔ اس سلسلہ میں بنیادی چیز تو یہ ہے کہ سوال، حضورؐ کے جسمِ اطہر کے کسی حصہ کا نہیں۔ سوال اس اصول کا ہے جسے ہم نے اوپر پیش کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ جب سوال حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کے فلم بنانے کا آئے گا تو یہ فلم خلا میں تو بنایا نہیں جائے گا۔ اس میں اس پورے ماحول کو سامنے لایا جائے گا اور ظاہر ہے کہ اس میں صحابہ کبارؓ بھی ہوں گے اور ازواجِ مطہراتؓ

بھی!! تو کیا اس تجویز کے پیش کرنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ چیز مسلمانوں کے نقطۂ خیال سے قابلِ اعتراض نہ ہوگی اور وہ اسے برداشت کر لیں گے؟ اور سب سے بڑی چیز یہ کہ جب آپ اس قسم کی فلم کی تجویز کو اصولاً پسند کر لیں گے تو پھر کیا یہ بات حضورؐ کے پائے اقدس تک ہی محدود رہے گی۔ بعد کی نسلوں میں آگے نہیں بڑھے گی؟ پھر اس میں ایک اور خطرہ بھی پنہاں ہے۔ مستشرقین کی بالعموم یہ روش ہے کہ وہ ہماری تاریخ کے غلط حصوں کو بنیاد قرار دے کر اپنی کتابوں میں نبی اکرمؐ کی ذات اقدس و اعظم کی طرف کئی خرافات منسوب کر دیتے ہیں۔ یہی روش وہ فلم میں بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ اور کتاب کے مقابلہ میں فلم جس قدر خطرناک نتائج پیدا کر سکتی ہے وہ ظاہر ہے۔

غرضیکہ جس پہلو سے بھی دیکھئے، یہ تجویز بڑے ہی ہولناک نتائج کی صدائے پیشیں ہے اور اس کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اس کی طرف فوری توجہ دی جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز نہ کسی ایک فرد سے متعلق ہے اور نہ ہی کسی ایک ملک کے مسلمانوں سے۔ یہ پوری ملت اسلامیہ کا مشترکہ مسئلہ ہے اس لئے اس کے متعلق اسی نہج سے سوچنا اور کچھ کرنا چاہیئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت مسلمانوں کے مختلف ممالک، متعدد وجوہات کی بنا پر تشتت و افتراق کا شکار ہیں، لیکن ہمارا خیال ہے کہ، بایں ہمہ، یہ سوال ایسا ہے جس پر تمام دنیا کے مسلمان یک زبان ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے، کہ ہم جو دنیا میں ایک اُمت بنتے ہیں تو محمد رسول اللہؐ پر ایمان لانے سے ایسا بنتے ہیں۔ حضورؐ کی ذاتِ گرامی ہی وہ رشتہ ہے جس سے ہماری شیرازہ بندی ہوتی ہے۔ اس لئے جس سوال کا تعلق حضورؐ کی ذات اقدس سے ہو، اس میں کسی اختلاف کا سوال پیدا نہیں ہونا چاہیئے۔ بنا بریں ہمیں یقین ہے کہ اس مسئلہ میں ساری دنیا کے مسلمان ایک مرکز پر جمع ہو جائیں گے۔ لیکن اس قسم کی جامعیت حکومتوں کی سطح پر ممکن ہے۔ اندریں حالات، ہم حکومت پاکستان سے استدعا کریں گے کہ وہ اس مسئلہ کو اپنی خصوصی توجہات کا مرکز بنائے، اور تحقیقِ حالات کے بعد دیگر مسلم ممالک سے اس ضمن میں فوری رابطہ پیدا کرے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ کسی بین الاقوامی قانون یا سمجھوتے کی رُو سے، فلم ساز کمپنیوں کو ایسا کرنے سے باز رکھا جا سکتا ہے یا نہیں، لیکن ہمیں یقین ہے کہ اگر مسلم ممالک کی طرف سے اس قسم کا مطالبہ متفقہ طور پر پیش کیا جائے تو وہ ضرور تسلیم کیا جائے گا۔ اگر حکومت وقتاً فوقتاً بتاتی رہے کہ اس ضمن میں کیا کچھ ہو رہا ہے تو وہ ہمارے جیسے کروڑوں مضطرب قلوب کے لئے وجہِ شکیبائی، اور باعثِ صد تشکر و امتنان ہوگا۔

(۴)

پاکستان کے جدید آئین کے متعلق اندازہ تھا کہ وسط فروری یا اس کے تیسرے ہفتہ تک اس کا اعلان

ہو جائے گا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو ہم زیرِ نظر شمارہ میں اس کے متعلق کچھ لکھ سکتے تھے۔ لیکن اب یہ اندازہ ہے کہ وہ شروع مارچ سے پہلے ملک کے سامنے نہیں آئے گا اس لئے اس پرچہ میں اس کے متعلق کچھ نہیں لکھا جا سکتا۔ (یہ پرچہ ہر ماہ کے آخری ہفتہ میں مرتب ہو کر پریس میں چلا جاتا ہے)۔ اس سلسلہ میں البتہ دو ایک اصولی گذارشات ہیں جنہیں ہم پیش کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ یہ آئین کسی کے پیشِ نظر معیار پر پورا نہ اترے یا اس کی بعض شقیں کسی کو پسند نہ آئیں۔ اس ضمن میں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ

(i) ایک چیز ہوتی ہے کسی آزاد خطۂ زمین کا اپنے قبضہ میں ہونا۔ اور

(ii) دوسری چیز ہوتی ہے اس خطۂ زمین میں ایسے آئین کا نفاذ جو ہمیں پسند آئے۔

اگر کبھی ایسا ہو کہ اس خطۂ زمین میں ہماری منشا کے مطابق آئین نافذ نہ ہو، تو اس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ خود اس خطۂ زمین ہی کو بیکار سمجھ لیا جائے۔ ایک آزاد خطۂ زمین کی قدر و قیمت کیا ہوتی ہے، اس کے متعلق پوچھئے (مثلاً) الجزائر کے مجاہدین سے، جو سات سال سے مسلسل اور متواتر اسقدر گراں بہا قربانیاں دے رہے ہیں۔ ان کی یہ قربانیاں کس مقصد کے لئے ہیں؟ ایک آزاد خطۂ زمین حاصل کرنے کے لئے۔ ہمیں اس قسم کا آزاد خطۂ زمین حاصل ہے۔ اب ظاہر ہے کہ کوئی ایسی حرکت جو اس خطۂ زمین کے استحکام کے لئے ضعف کا باعث ہو، عطیہ فطرت کی کسقدر ناشکر گزاری اور ملت کے خلاف کتنا سنگین جرم ہوگا۔ اگر کسی وقت کوئی آئین یا قانون ہماری منشا کے مطابق مرتب نہیں ہوتا، تو اسے آئینی طور پر بدلنے یا اس میں ترمیم کرنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ لیکن اگر اس خطۂ زمین ہی کو ضعف پہنچ جائے تو پھر حسبِ منشاء آئین مرتب کرنا تو ایک طرف، آزادی کی زندگی بسر کرنا بھی ممکن نہیں رہتا۔

اندریں حالات، اگر مجوزہ آئین ہماری منشا کے مطابق نہ ہو، تو بھی ہماری طرف سے کسی قسم کی کوئی حرکت ایسی نہیں ہونی چاہیئے جو کسی نوع سے بھی مملکتِ پاکستان کے لئے ضعف کا باعث ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ ملک میں ہنگامے برپا کرنا یا عوام کے جذبات کو مشتعل کر کے، امن کو خطرہ میں ڈالنا، مملکت کے لئے بڑے ضعف کا باعث ہوتا ہے۔ اس لئے ہم تمام پاکستان دوست اور محبِ وطن عناصر سے درخواست کریں گے کہ وہ اس باب میں بڑے محتاط رہیں اور جذبات کی رو میں بہ کر کسی ایسی حرکت کے مرتکب نہ ہوں جو اس خطۂ زمین کے لئے کمزوری کا باعث بن جائے۔ خطۂ زمین ہمارے پاس ہوگا تو اس پر ہماری منشا کے مطابق عمارت بھی استوار ہو سکے گی — آج نہیں تو اس کے بعد پھر کبھی — لیکن اگر (خدانکردہ) وہ خطۂ زمین ہی پاس نہ رہے، یا اس میں ضعف آجائے، تو پھر اس پر عمارت استوار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ یوں تو اس قسم کی احتیاط کی ہر وقت ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن جب ایک مملکت نوزائیدہ ہو، اور حریف اس پر آنکھیں لگائے بیٹھے ہوں، تو اس وقت یہ احتیاط اور بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ خدا اس سرزمین کو ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رکھے، کہ یہ ہمارے اور ہماری آنیوالی نسلوں کے آزاد اور اسلامی نظام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا لاینفک ذریعہ ہے۔

پرویز صاحب کا مکتوب

محترم مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے نام

ابھی ابھی مولوی صاحبان کی طرف سے پرویز صاحب کے خلاف کفر کا ایک فتویٰ شائع ہوا ہے جسے ایک پمفلٹ کی صورت میں بڑی شد و مد سے ہر جگہ تقسیم کیا جا رہا ہے۔ اس پمفلٹ کا تمہیدی بیان چونکہ مفتی محمد شفیع صاحب کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ اس لئے پرویز صاحب نے انہیں ایک خط لکھا ہے جو درج ذیل ہے۔ اس خط کی نقول اخبارات کو بھی بغرض اشاعت ارسال کر دی گئی ہیں۔ (ادارہ)

۲۵- بی گلبرگ - لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

۱۷ فروری ۱۹۶۲ء

محترمی مفتی صاحب! السلام علیکم

مجھے ایک پمفلٹ موصول ہوا ہے۔ جس کا عنوان ہے۔

علمائے امت کا متفقہ فتویٰ

پرویز کافر ہے۔

اس فتویٰ کے تمہیدی بیان کے متعلق پمفلٹ میں لکھا ہے کہ وہ آپ کا تحریر فرمودہ ہے۔ اس تمہیدی بیان کے آخر میں آپ نے لکھا ہے کہ:-

> علماء کو کوئی خوشی نہیں کہ کسی مدعیٔ اسلام کے بارے میں اس کے خلاف کوئی رائے رکھیں۔ بلکہ فقہاء کی اس معاملہ میں انتہائی احتیاط ہر قدم پر ان کے سامنے ہے۔ مگر مجبور ہو کر یہ قدم اٹھانا پڑا ہے۔ اور پھر بھی ہم یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم سے کسی اقتباس کے اخذ کرنے میں کوئی فروگذاشت ہوئی یا پرویز صاحب کا مفہوم ہم نے کسی جگہ غلط سمجھا ہو تو ہمیں مطلع فرمایا جائے۔ ہم شکریہ کے ساتھ اس پر غور کریں گے۔

میں یہ عریضہ آپ کے بیان کے اسی آخری حصے کے سلسلے میں ارسال خدمت کر رہا ہوں۔

۲- میں سب سے پہلے یہ دریافت کرنے کی جرأت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ ضروری نہیں تھا کہ جب یہ اقتباسات اخذ کئے گئے تھے۔ اور ان سے کچھ مفہوم مستنبط کیا گیا تھا تو قبل اس کے کہ ان پر فتویٰ لیا جاتا اور اس فتویٰ کی اس طرح

عام اشاعت کی جاتی، مجھ سے دریافت کر لیا جاتا کہ کیا یہ اقتباسات صحیح طور پر اخذ کئے گئے ہیں اور جو مفہوم تمہاری طرف منسوب کیا گیا ہے وہ صحیح ہے؟ کیا یہ عجیب انداز نہیں کہ پہلے فتویٰ صادر کر دیا جائے اور اس کے بعد پوچھا جائے کہ کیا ہم نے صحیح بنیادوں پر فتویٰ صادر کیا ہے؟

۳۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ میری تحریروں سے ایک ایک آدھ آدھ فقرہ اِدھر اُدھر سے اخذ کر لیا گیا ہے اور انہیں "مکمل اقتباسات" کہہ کر پیش کر دیا گیا ہے۔ پھر ان منتشر ٹکڑوں سے جو مفہوم مرتب کیا گیا ہے، وہ بے حد غلط اور گمراہ کن ہے۔

۴۔ اب جبکہ آپ فتویٰ صادر فرما چکے ہیں اور اس کی اس طرح سے عام اشاعت بھی کر چکے ہیں تو اس کے بعد میری طرف سے کوئی وضاحت کیا مفید نتیجہ پیدا کر سکتی ہے؟ بایں ہمہ اگر آپ اس کا ذمہ لیں کہ جن مقامات پر یہ فتویٰ بھیجا گیا ہے وہاں میرا بیان بھی بھجوا دیا جائے گا تو میں ان تمام شقوں کے متعلق جن پر یہ فتویٰ شائع کیا گیا ہے اپنی تحریروں کے مکمل اقتباسات اور ان کا صحیح مفہوم ارسال خدمت کر دوں گا۔

۵۔ سر دست میں اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم نے اُس شخص کو مومن کہا ہے

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ (۲/۱۷۷)

میں ان تمام امور پر اُن تصریحات کے مطابق جو قرآن کریم میں مذکور ہیں، ایمان رکھتا ہوں۔ میں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خدا کا آخری نبی اور رسول اور قرآن کریم کو تمام نوعِ انسان کے لئے آخری ضابطۂ حیات مانتا ہوں۔ ارکانِ اسلام (نماز۔ روزہ۔ وغیرہ) کے متعلق میرا مسلک یہ ہے کہ امت کے مختلف فرقے انہیں جس جس طریق سے ادا کرتے چلے آ رہے ہیں، کسی شخص کو حق حاصل نہیں کہ ان میں کوئی ردّ و بدل کرے یا کوئی نیا طریق وضع کرے۔

(ب) اطاعتِ خدا اور رسولؐ کے متعلق جو کچھ میں کہتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صورت یہ نہیں تھی کہ ہر شخص اپنے اپنے مفہوم کے مطابق خدا اور رسولؐ کی اطاعت کر لیتا تھا۔ اس کی صحیح شکل یہ تھی کہ حضورؐ کے بعد جو خلافت علیٰ منہاج النبوت قائم ہوئی تھی اس سے پوچھا جاتا تھا کہ فلاں معاملہ میں خدا اور رسولؐ کی اطاعت کس طرح کی جائے گی۔ جو فیصلہ وہاں سے ملتا اُسے خدا اور رسولؐ کی اطاعت سمجھا جاتا۔ اسی سے وحدتِ اُمت قائم تھی۔ جب خلافت باقی نہ رہی تو خدا اور رسولؐ کی اطاعت انفرادی طور پر ہونے لگی۔ اِس سے اُمت میں افتراق پیدا ہوا۔ اُمت میں دوبارہ وحدت پیدا کرنے کی صورت یہ ہے کہ پھر خلافت علیٰ منہاج نبوت قائم کی جائے اور اُس کے فیصلوں کے مطابق خدا اور رسولؐ کی اطاعت کی جائے۔ اسی خلافت کو، بغرضِ اختصار مرکزِ ملت یا اسلامی نظام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور میں اس کی بار بار وضاحت کر چکا ہوں۔ میں نہ ہر نظامِ حکومت کو اسلامی نظام

کہتا ہوں اور نہ اس کے فیصلوں کی اطاعت کو خدا اور رسولؐ کی اطاعت۔ میرے نزدیک خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کے علاوہ کوئی نظامِ اسلامی نہیں کہلا سکتا۔ اور نہ اُسے "مرکزِ ملت" کہا جا سکتا ہے۔

(ج) میں ہر اُس حدیث کو صحیح مانتا ہوں جو قرآن کے خلاف نہ ہو۔ یا جس میں نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی شان میں کوئی طعن نہ پایا جاتا ہو۔ میں صرف اُن وضعی روایات کو "عجمی سازش" سے تعبیر کرتا ہوں جن میں غیر اسلامی معتقدات اور رسومات کو اسلام کے لباس میں پیش کیا گیا ہے۔

۶۔ جس لٹریچر کی بنا پر مجھے "کافر" قرار دیا جا رہا ہے میں اُس کے متعلق اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ اس وقت اس ملک میں ہزاروں تعلیم یافتہ نوجوان ایسے ہیں جو اس لٹریچر کی بدولت اسلام کے گرویدہ ہیں اور اگر یہ لٹریچر ان تک نہ پہنچتا تو وہ کبھی کے مغربی مادیت یا روس کے کمیونزم کی آغوش میں جا چکے ہوتے۔ میں اس پایاں کرم کے لئے بدرگاہِ رب العزت قدم قدم پر سجدہ ریز ہوں کہ اُس نے مجھے یہ توفیق عطا فرمائی۔

۷۔ چونکہ یہ عریضہ آپ کے اس بیان کے ضمن میں ارسال کر رہا ہوں جو آپ نے پمفلٹ میں شائع کر دیا ہے، اس لئے اپنے اس عریضہ کو بھی بغرضِ اشاعت پریس میں بھیج رہا ہوں۔

والسلام

خیر طلب

پرویز

حضرت مسیح کی انقلاب آفریں تعلیم

عیسائیت کی مروجہ تعلیمات کی رو سے حضرت مسیح علیہ السلام کی شخصیت کا جو نقشہ سامنے آتا ہے وہ کچھ اس نوعیت کا ہے کہ خدا کے اس جلیل القدر پیغمبر کی زندگی ایک تارک الدنیا اور عاجز و ناتواں زاہد گوشہ نشین کی سی زندگی تھی اور انھوں نے قدوسیوں کی جو جماعت پیدا کی وہ بھی در بدر پھرنے والے مفلوک الحال فقیروں کا سا ایک گروہ تھا جو مسکینی، عاجزی اور بیچارگی میں برّۂ معصوم کی طرح زندگی بسر کرتا رہا۔ کچھ اس قسم کی تعلیمات آپ کی ذات گرامی کی طرف منسوب کی جاتی ہیں کہ ایک گال پر تھپڑ کھا کر دوسرا گال آگے بڑھا دو۔ جو کوئی کرتا لینا چاہے اُسے از خود چغہ اتار کر دیدو۔ جو ایک کوس بیگار میں لے جائے اُس کے ساتھ دو کوس تک چلے جاؤ۔ دشمن سے بھی محبت کرو۔ شریر کا مقابلہ نہ کرو۔ ظالم سے ظلم کا انتقام نہ لو۔ مظلومی، عاجزی اور انکساری کی زندگی بسر کرو وغیرہ وغیرہ۔

یہ الفاظ بظاہر بڑے خوش آئند اور دلکش فریب نظر آتے ہیں لیکن جن لوگوں کی نگاہیں قرآنی حقائق پر ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس قسم کی تعلیم کبھی آسمانی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ انھیں معلوم ہے کہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام اس دنیا میں ایک انقلاب عظیم کی دعوت لے کر آئے تھے۔ ان کی بعثت کا مقصد اولیٰ ہی ظلم و جبر کی قوتوں کے پنجے توڑ کر مظلوم و مقہور نوعِ انسانی کو آزادی اور سربلندی عطا کرنا تھا۔ ان کی حیاتِ طیبہ اس مقدس فریضہ کی ادائیگی میں تھی کہ انسانوں کو بے بسی اور بیچارگی کے بندھنوں سے نجات دلا کر کشادِ زندگی سے بہرہ ور کیا جائے۔ ان سب کی دعوتِ انقلاب اس نصب العین کی تقیب تھی کہ اولادِ آدم کو ملوکیت، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت اور اسی قسم کی دوسری زنجیروں میں مقید نہیں رکھا جا سکتا۔

مسیح علیہ السلام یقیناً اسی انقلاب آفریں اور جاں انگیز پیغام کے داعی تھے اور انھوں نے اولوالعزم قدوسیوں کی جو جماعت تیار کی تھی ان میں سر دھڑ کی بازی لگانے کے ولولے اسی شدت آرزو اور بے تابیٔ تمنا کے ساتھ موجود تھے جو دیگر انبیائے کرام کے رفقائے جلیل میں۔ چنانچہ اسی ماہ کے ایک درسِ قرآنی میں پرویز صاحب نے (خود اناجیل کے

حوالوں سے) حضرت مسیح علیہ السلام کی شخصیت عالیہ اور دعوتِ انقلاب کی جو نکھری نکھری اور اجلی اجلی تصویر پیش کی وہ اسی حقیقتِ مستور کی نقاب کشائی کر رہی تھی۔ اور اس سے یہ حقیقت ابھر کر نگاہوں کے سامنے آ گئی تھی کہ جس طرح صاحبِ ضربِ کلیم نے اپنی دعوتِ انقلاب کی لرزہ خیز قوتوں کے زور پہ فرعون کی ملوکیت، قارون کی سرمایہ داری اور ہامان کی مذہبی پیشوائیت کی مہیب قہرمانیوں سے ٹکر لی۔ بعینہٖ اسی عزم و جلال سے مسیح علیہ السلام بھی بنی اسرائیل کو رومی شہنشاہیت، سرمایہ داری اور یہودی علماء و مشائخ کے استبداد سے نجات دلانے آئے تھے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو حضرت مسیح علیہ السلام کی راہ میں جو مشکلات حائل تھیں وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی بڑھ چڑھ کر تھیں اور سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ خود بنی اسرائیل اپنے احبار و رہبان کی قیادت میں ان کے خون کے پیاسے اور جان کے لاگو تھے۔ ان یہودی احبار و رہبان کو صاف نظر آ رہا تھا کہ جس مسلکِ حیات کی طرف خدا کا یہ اولوالعزم نبی دعوت دے رہا ہے، اس سے ان کی مذہبی سیادت اور پیشوائیت کی گدیاں ہمیشہ کے لئے چھن جائیں گی۔

مصائب و مشکلات کے اس نامساعد ماحول میں مسیح علیہ السلام کی دعوتِ انقلاب کا آغاز ہوا۔ بدقسمتی یہ ہے کہ صدیوں کی تحریفات سے حضرت عیسٰیؑ کی صحیح تعلیم اناجیل سے بمشکل سامنے آتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس رطب و یابس میں پھولوں کی بکھری ہوئی پتیوں کی طرح کہیں کہیں اس آسمانی دعوت کی جھلک موجود ہے جو حضرت عیسٰیؑ علیہ السلام نے پیش کی۔ پرویز صاحب کے مذکورہ درسِ قرآنی میں انہی حسین پتیوں کو سامنے لایا گیا تھا اور اسی کو پیشِ نظر رکھ کر ہم اس انقلابی پیغام کے چند گوشے قارئین کے سامنے لا رہے ہیں جو دیگر انبیائے کرامؑ کی طرح مسیح علیہ السلام کی زبانی فردوسِ گوش بنا۔ چونکہ ہر نبی کی تعلیم (اپنے بنیادی مقاصد کے اعتبار سے) ملوکیت، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کے استبداد اور قہرمانیوں کے خلاف کھلا چیلنج ہوتی ہے اس لئے اس پیغام میں بھی اسی اعلانِ جنگ کی صدائے بازگشت سنائی دے گی۔

ان تعلیمات سے قبل مشہور مورخ (CECIL ROTH) کی مشہور کتاب

(A short History of the Jewish people)

کا یہ اقتباس سامنے لے آیئے کہ

(حضرت مسیح) ان لوگوں میں سے تھے جنہیں رومی اربابِ حکومت نے اس جرم کی پاداش میں حوالۂ دار و رسن کر دیا کہ انہوں نے اپنی قوم کے حقوق و مفاد کی بازیابی کی جرأت کی تھی۔ حضرت یسوعؑ کے سامنے دو مقاصد تھے۔ ایک طرف آپ مسیح موعود ہونے کے مدعی تھے۔ جسے بنی اسرائیل کو غیروں کی غلامی اور محکومی سے چھڑانے کے لئے آنا تھا۔ اور دوسرے انہیں ان اخلاقی اور معاشرتی ضوابط

پابندی کرانی تھی جو بنی اسرائیل کے مصلحین کی نمایاں خصوصیت تھی۔ (صفحہ ۱۴۰)

اعلان جہاد

مسیح علیہ السلام کی تعلیم عاجزی اور بیچارگی اختیار کرنے کی تعلیم نہیں تھی بلکہ یہ ظلم و جبر کی مستبد قوتوں کے خلاف زندگی اور اس کی ہر متاع عزیز کی بازی لگا دینے کا اعلان تھا۔ متی کی انجیل اس دعوت جہاد کو یوں پیش کرتی ہے۔

یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں۔ صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلانے آیا ہوں۔ کیونکہ میں اس لئے آیا ہوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے، اور بیٹی کو اس کی ماں سے، اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کر دوں۔ اور اس آدمی کے دشمن اس کے گھر ہی کے لوگ ہوں گے۔ جو کوئی باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں۔ اور جو کوئی اپنی صلیب نہ اٹھائے اور میرے پیچھے نہ چلے وہ میرے لائق نہیں۔ (متی ۱۰ — ۳۴ — ۳۸)

رفقائے انقلاب کے نام

حضرت مسیح اپنے سرفروش فدائیوں کو جب آسمانی دعوت کی اشاعت و تبلیغ کے لئے روانہ کرتے ہیں تو انہیں حسب ذیل ہدایات سے مستفید فرماتے ہیں۔

ان بارہ کو یسوع نے بھیجا اور انہیں حکم دے کے کہا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا۔ اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا۔ بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔ اور چلتے چلتے منادی کرنا کہ آسمان کی بادشاہت نزدیک آگئی ہے۔ بیماروں کو اچھا کرنا۔ مردوں کو جلانا۔ کوڑھیوں کو پاک صاف کرنا۔ بدروحوں کو نکالنا۔ تم نے مفت پایا مفت دینا۔ نہ سونا اپنے کمربند میں رکھنا نہ چاندی نہ پیسے۔ راستے کے لئے نہ جھولی لینا۔ نہ دو دو کرتے۔ نہ جوتیاں۔ کیونکہ مزدور اپنی خوراک کا حق دار ہے۔ اور جس شہر یا گاؤں میں داخل ہونا۔ دریافت کرنا کہ اس میں کون لائق ہے اور جب تک وہاں سے روانہ نہ ہو اسی کے ہاں رہو اور گھر میں داخل ہوتے وقت اسے دعائے خیر دو اور اگر وہ گھر لائق ہو تو تمہارا سلام اسے پہنچے۔ اور اگر لائق نہ ہو تو تمہارا سلام تم پر پھر آئے۔ اور اگر تمہیں کوئی قبول نہ کرے اور تمہاری باتیں نہ سنے تو اس گھر یا اس شہر سے نکلتے وقت اپنے پاؤں کی گرد جھاڑ دو۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ عدالت کے دن اس شہر کی نسبت سدوم اور عمورہ کے علاقہ کا حال زیادہ برداشت کے لائق ہوگا۔

اس کے بعد فرمایا کہ

دیکھو میں تمہیں بھیجتا ہوں گویا بھیڑوں کو بھیڑیوں کے بیچ میں۔ پس سانپوں کی مانند ہوشیار اور کبوتروں کے مانند بھولے بنو۔ مگر آدمیوں سے خبردار رہو۔ کیونکہ وہ تمہیں عدالتوں کے حوالے کریں گے۔

" اور اپنے عبادت خانوں میں تمہارے کوڑے ماریں گے ۔ اور تم میرے سبب حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے حاضر کئے جاؤ گے ۔ تاکہ ان کے اور غیر قوموں کے لئے گواہی ہو ۔ لیکن جب وہ تمہیں پکڑوائیں تو فکر نہ کرنا کہ ہم کس طرح کہیں اور کیا کہیں ۔ کیونکہ جو کچھ کہنا ہوگا اس گھڑی تمہیں بتایا جائے گا ۔ کیونکہ بولنے والے تم نہیں بلکہ تمہارے باپ کا روح ہے جو تم میں بولتا ہے ۔ بھائی کو بھائی قتل کے لئے حوالے کریگا اور بیٹے کو باپ ۔ بیٹے اپنے ماں باپ کے برخلاف کھڑے ہو کر انہیں مروا ڈالیں گے اور میرے نام کے باعث سب لوگ تم سے عداوت کریں گے ۔ مگر جو آخر تک برداشت کرے گا وہی نجات پائے گا لیکن جب تمہیں ایک شہر میں ستائیں تو دوسرے کو بھاگ جاؤ ۔ کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تم اسرائیل کے سب شہروں میں نہ پھر چکو گے کہ ابن آدم آ جائے گا ۔ (متی ۱۰/۱۶—۲۳)

یہودی پیشوائیت زلزلے میں

مذہبی اجارہ دار جو اپنی "خدائی" کی مسند پر بیٹھ کر خدا اور مذہب کے نام پر اپنی ہوسناکیوں کے لئے سامان تسکین پیدا کرتے ہیں کس طرح دین خداوندی کی آسمانی دعوت کو اپنی پیشوائیت کی مفاد پرستیوں کے لئے سامان موت سمجھتے ہیں اس کا اندازہ یہودی علماء و شیوخ کی اس چیخ و پکار سے لگائیے جسے انجیل برناباس میں بالفاظ ذیل پیش کیا گیا ہے ۔

تب ان لوگوں نے کاہنوں کے سردار کے ساتھ مشورہ کیا ۔ اور کہا " اگر یہ آدمی بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے ۔ البتہ یہ ہم پر بڑی مصیبت ہوگی اس لئے کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقہ کے موافق اصلاح کرنا چاہتا ہے ۔ کیونکہ وہ ہماری تقالید (رسومات) کو باطل کرنے کی قدرت نہیں رکھتا تب اس جیسے آدمی کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہوگا ؟ یقیناً ہم اور ہماری اولاد (سب) تباہ ہو جائیں گے اس لئے کہ ہم اپنی خدمت سے نکال دیئے جائیں گے تو ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگیں ۔

حالانکہ اس وقت یہ خدا کا شکر ہے کہ ہمارا ایک بادشاہ اور ایک حاکم دونوں ہماری شریعت سے اجنبی ہیں ۔ اور ہماری شریعت کی کوئی پرواہ کرنے والے نہیں ۔ جیسے کہ ہم ان کی شریعت کی کچھ پرواہ نہیں کرتے اور اسی سبب سے ہم قدرت رکھتے ہیں کہ جو چاہیں وہ کر لیں ۔ پس اگر ہم نے غلطی کی تو ہمارا اللہ رحیم ہے قربانی اور روزہ کے ساتھ اس کا راضی بنا لینا ممکن ہے ۔ مگر جبکہ یہ آدمی بادشاہ ہو گیا تو ہرگز نہ راضی بنایا جا سکے گا مگر جبکہ اللہ کی عبادت ویسے ہی ہوتے دیکھے جیسی کہ موسیٰ نے لکھی ہے ۔ (انجیل برنباس فصل صفحہ ۱۴۲)

علماء و مشائخ کے کردار کی ایک جھلک

یہ یہودی علماء و مشائخ کس خبث باطن کے مظہر اور کس پستی کردار کے پیکر تھے اس کی تصویر بھی اناجیل کے اوراق میں ملے گی۔ سچ پوچھئے تو مسیح علیہ السلام کا سب سے بڑا "جرم" یہی تھا کہ انہوں نے ان احبار و رہبان کی دسیسہ کاریوں کے خلاف جو اپنے مصنوعی تقدس کے زریں نقاب میں نوع انسانی کی بدبختی کا سامان بن گئے تھے صدائے حق بلند کی تھی۔ یہ تنقید کس قدر شدت کا انداز اختیار کئے ہوئے تھی اس کا اندازہ اناجیل کے حسب ذیل بیانات سے بخوبی ہو سکے گا۔ سنئے! متی کی انجیل میں ہے کہ

اُس وقت یسوع نے بھیڑ سے اور اپنے شاگردوں سے یہ باتیں کہیں کہ فقیہہ اور فریسی موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں۔ پس وہ جو کچھ تمہیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن ان کے سے کام نہ کرو۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔ وہ ایسے بھاری بوجھ جن کا اٹھانا مشکل ہے باندھ کر لوگوں کے کندھوں پر رکھتے ہیں۔ مگر آپ انہیں انگلی سے بھی ہلانا نہیں چاہتے۔ وہ اپنے سب کام لوگوں کے دکھانے کو کرتے ہیں کیونکہ اپنے تعویز بڑے بناتے اور اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے ہیں اور ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجے کی کرسیاں۔ اور بازاروں میں سلام اور آدمیوں سے ربی کہلانا پسند کرتے ہیں۔ مگر تم ربی نہ کہلاؤ۔ کیونکہ تمہارا استاد ایک ہی ہے اور تم سب بھائی ہو۔ اور زمین پر کسی کو اپنا باپ نہ کہو۔ کیونکہ تمہارا باپ ایک ہی ہے جو آسمانی ہے۔ اور نہ تم ہادی کہلاؤ۔ کیونکہ تمہارا ہادی ایک ہی ہے یعنی مسیح۔ لیکن جو تم میں بڑا ہے وہ تمہارا خادم بنے۔ اور جو کوئی اپنے آپ کو بڑا بنائے گا وہ چھوٹا کیا جائے گا۔ اور جو اپنے آپ کو چھوٹا بنائے گا وہ بڑا کیا جائے گا۔

اے ریاکار فقیہو! اور فریسیو۔ تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو۔ کیونکہ نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے! کہ ایک مرید کرنے کے لئے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو۔ اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دونا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔

اے اندھے راہ بتانے والو! تم پر افسوس ہے! جو کہتے ہو کہ اگر کوئی مقدس کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں لیکن اگر مقدس کے سونے کی قسم کھائے تو اُس کا پابند ہوگا۔ اے احمقو اور اندھو۔ کونسا بڑا ہے؟ سونا یا مقدس جس نے سونے کو مقدس کیا؟ اور پھر کہتے ہو کہ اگر کوئی قربان گاہ کی قسم کھائے تو کچھ بات

نہیں۔ لیکن جو نذر اس پر چڑھی ہو اگر اُس کی قسم کھائے تو اس کا پابند ہوگا۔ اے اندھو! کونسی چیز بڑی ہے؟ نذر یا قربان گاہ جو نذر کو مقدس کرتی ہے۔ پس جو قربان گاہ کی قسم کھاتا ہے وہ اُس کی اور سب چیزوں کی جو اُس پر ہیں قسم کھاتا ہے۔ اور جو مقدس کی قسم کھاتا ہے وہ اُس کی اور اس کے رہنے والے کی قسم کھاتا ہے اور جو آسمان کی قسم کھاتا ہے وہ خدا کے تخت کی اور اُس پر بیٹھنے والے کی قسم کھاتا ہے۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے! کہ پودینے اور سونف اور زیرے پر دہکی دیتے ہو۔ اور تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف اور رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے۔ لازم تھا کہ یہ بھی کرتے اور وہ بھی نہ چھوڑتے۔ اے اندھے راہ بتانے والو۔ جو مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو۔ تم پر افسوس ہے! کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں، مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہوئی ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو۔ مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ نبیوں کی قبریں بناتے اور راستبازوں کے مقبرے آراستہ کرتے ہو۔ اور کہتے ہو کہ اگر ہم اپنے باپ دادوں کے زمانے میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں اُن کے شریک نہ ہوتے۔ اس طرح تم اپنی نسبت گواہی دیتے ہو کہ ہم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہیں۔ غرض اپنے باپ دادوں کا پیمانہ بھر دو۔ اے سانپو۔ اے افعی کے بچو۔ تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے؟ اس لئے دیکھو۔ میں نبیوں اور داناؤں اور فقیہوں کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ اُن میں سے بعض کو قتل کرو گے اور صلیب پر چڑھاؤ گے اور بعض کو عبادت خانوں میں کوڑے مارو گے اور شہر بشہر ستاتے پھرو گے۔ تاکہ سب راستبازوں کا خون جو زمین پر بہایا گیا تم پر آئے۔ راستباز ہابیل کے خون سے لے کر برکیاہ کے بیٹے زکریاہ کے خون تک جسے تم نے مقدس اور قربان گاہ کے درمیان قتل کیا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ یہ سب کچھ اس زمانے کے لوگوں پر آئے گا۔

(متی ۲۳ : ۱۶ ـ ۳۶)

یہ ہے ایک دھندلا سا عکس اس برگزیدہ نبی کی انقلابی تعلیم کا جو اپنی آسمانی دعوت انقلاب اور عظمت کردار سے

بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کو نجات دلاتے اور مقام انسانیت پر فائز کرنے آیا تھا۔ لیکن ملوکیت اور پیشوائیت کی مخصوص مصلحتوں اور مفاد پرستیوں نے ان تعلیمات کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا۔ اور اپنی پر فریب تحریفات سے اس انقلاب آفریں شخصیت کے مقام و پیام پر ایسے پردے ڈال لئے کہ اب عیسائیت اپنی مروجہ تعلیمات کی رُو سے، خانقاہ نشین زاہد مسکینوں، عاجزوں اور بے بسوں کا مذہب نظر آتی ہے۔ یاد رکھئے مسیح علیہ السلام کی پیغمبرانہ دعوت کے جو گوشے ہم نے ان صفحات میں پیش کئے ہیں وہ کسی ایک دور سے وابستہ نہیں۔ ملوکیت اور سرمایہ داری اور پیشوائیت ہر دور میں اسی کردار کا مرتع نظر آئے گی جس کی تصویر ان اقتباسات میں جھلک رہی ہے۔

سلیم کے نام خطوط

یہ حقیقت کشا خطوط قلب سلیم میں ابھرتے ہوئے سینکڑوں سوالات کا تفصیلی جواب پیش کرتے ہیں۔ اور نوجوانانِ ملت کے قلب و نظر کے لئے ایک صحیح و صالح انقلاب کی جاں نواز تحریک ہیں۔

جلد اوّل ——— آٹھ روپے
جلد دوم ——— چھ روپے
جلد سوم ——— چھ روپے

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ
۲۷-بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

حقائق و عبر

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے؟

پشاور سے شائع ہونے والے 'روزنامہ انجام' کی ۹ر فروری کی اشاعت میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی۔

پشاور ۸ر فروری۔ (سٹاف رپورٹر) - دار التصنیف جامعہ اسلامیہ، اکوڑہ، خٹک کی طرف سے شائع کردہ کتابچہ "خوفناک سازش" کی اشاعت پر مسٹر پرویز نے جو مقدمہ دائر کیا ہے اس کی سماعت ۱۲ر فروری کو سشن کورٹ، پشاور، میں ہو رہی ہے۔ یہ مقدمہ مسٹر پرویز نے منظورِ عام پریس کے مالک کے خلاف دائر کیا ہے۔ اس کتابچہ میں مسٹر پرویز کے حوالے سے ثابت کیا گیا ہے کہ فتنۂ انکارِ حدیث، اسلام کے خلاف ایک خوفناک سازش ہے۔

پھر اسی اخبار کی ۱۰ر فروری کی اشاعت میں یہ خبر شائع ہوئی:

پشاور۔ ۹ر فروری۔ (سٹاف رپورٹر) آج پشاور اور شہر کی تمام جامع مساجد میں "خوفناک سازش" نامی کتابچہ کے خلاف مسٹر پرویز کی طرف سے سیشن کورٹ میں جو مقدمہ زیرِ سماعت ہے، اس کی کامیابی کی دعائیں مانگی گئیں۔ اور دعا کی گئی کہ خدا اس مقدمے میں منظورِ عام پریس کے مالک کو بری کرے۔ اس مقدمے کی پیشی ۱۲ر فروری کو ہے۔ اس کتابچہ میں جامعہ اسلامیہ اکوڑہ خٹک کی طرف سے ثابت کیا گیا ہے کہ مسٹر پرویز کا فتنۂ انکارِ حدیث اسلام کے خلاف ایک سازش ہے۔

اس کے بعد، روزنامہ شہباز (پشاور) کی ۱۴ر فروری کی اشاعت میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی ہے۔

پشاور۔ ۱۲ر فروری۔ جامعہ اسلامیہ پاکستان کی طرف سے شائع شدہ کتابچہ بعنوان۔ خدا رسول، قرآن اور ملت کے خلاف خوفناک سازش کا انکشاف کے سلسلہ میں مسٹر پرویز کی طرف سے منظورِ عام پریس پشاور کے مالک حاجی محمد حسین کے خلاف جو مقدمہ دائر کیا گیا تھا اس میں

آج وہ باعزت طور پر بری کر دیئے گئے۔ مقدمہ کی سماعت جناب خان قیصر خان سیشن جج کی عدالت میں ہوئی۔ حاجی محمد حسین صاحب کی طرف سے حافظ محمد عنایت اللہ زیراب وکیل پیش ہوئے عدالت نے پریس کے مالک پر عائد کردہ الزام سے انہیں باعزت طور پر بری کر دیا۔

خبریں آپ پڑھ چکے۔ اس کے بعد آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ پرویز صاحب نے اس ضمن میں کسی کے خلاف کوئی مقدمہ دائر نہیں کیا۔

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور کی

مطبوعات

راولپنڈی میں ——— لندن بک کمپنی اینڈ ورڈ ریڈ صدر
مکتبۂ اخوت۔ جامع مسجد روڈ

پشاور میں ——— ادارۂ اشاعت سرحد۔ قصہ خوانی بازار

نوشہرہ میں ——— منظور برادرز۔ صدر بازار

کیمبل پور میں ——— خزینۂ علم و ادب

لائل پور میں ——— دانش کالج (بالائی منزل)۔ ریل بازار

ان کے علاوہ دوسرے شہروں کے تاجران کتب تاجرانہ شرح پر اگر ہماری مطبوعات لینا چاہتے ہیں تو براہِ راست ہم سے خط و کتابت کریں

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ۲۷۔بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

رابطۂ باہمی

(بزمہائے طلوعِ اسلام کی ماہانہ رپورٹیں)

پرویز صاحب کا ورودِ سیالکوٹ

احباب کی پُر زور دعوت کو شرفِ پذیرائی بخشتے ہوئے، سالِ گزشتہ کی طرح، پرویز صاحب ایک بار پھر سیالکوٹ میں تشریف لائے۔ چار اور پانچ فروری کی شام کو انہوں نے بالترتیب جناح ہال میں دو اہم موضوعات پر خطاب فرمایا۔ پہلے دن کا موضوع تھا ــــ "ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں ہے؟" ــــ اور دوسرے روز ان کے خطاب کا موضوع تھا ــــ "فردوسِ گم گشتہ ــــ جس کی تلاش میں یورپ مارا مارا پھر رہا ہے۔"

۴ فروری کی شام کو جب مفکرِ قرآن، جناح ہال میں ورود فرما ہوئے تو جناح ہال کھچا کھچ بھرا ہوا، ان کے لئے وقفِ انتظار تھا۔ سیالکوٹ کی معروف علمی شخصیتیں شریکِ اجلاس تھیں۔ وکلا حضرات، پروفیسر، ڈاکٹر صاحبان، اعلیٰ افسران، گرلز کالج کی پرنسپل صاحبہ (معہ لیڈی پروفیسرز و طالبات) ہال میں رونق افروز تھے۔ ضلع کے مختلف گوشوں ــــ شکرگڑھ، چونڈہ، گودھ پور، چٹی شیخاں، کوٹلی وغیرہ ــــ سے بھی شائقین کی بہت بڑی تعداد معزز مہمان کے خطاب سننے کے شوق میں یہاں کھنچی چلی آئی تھی۔

ہر دو اہم علمی موضوعات اور پھر پرویز صاحب کا حسنِ بیان، یوں نظر آتا تھا گویا جناح ہال کی فضا میں علم و حکمت کے موتیوں کی بارش شروع ہو گئی اور وارفتگانِ شوق، شادابیٔ قلب و نگاہ کی فراوانیوں سے مالا مال ہو رہے ہیں۔

"فردوسِ گم گشتہ" سے متعلق خطاب تو روح نوازیوں کا یادگار منظر پیدا کر رہا تھا۔ ابنِ آدم کی کھوئی ہوئی جنت کی تلاش میں مغرب کی سرگردانیاں، ان کے اپنے اربابِ علم و فکر کی زبان سے، ان کی علمی کاوشوں کا اچھا تلا جائزہ، ان کی بے بسی

اور بیچارگی کی چیخ و پکار، ان کی حرماں نصیبیوں اور خانہ خرابیوں کا عبرت انگیز مرقع یہ سب کچھ اس یادگار مجلس کے لئے علم و بصیرت کے نئے باب کا افتتاح کر رہا تھا۔ عقل خود بین کے تقاضوں پر تکیہ کرنے والے قلوب و اذہان ایک نئی کروٹ لے رہے تھے۔ زندگی کی حسین منزلیں نکھر نکھر کر اور فردوس گم گشتہ کے مختلف گوشے اپنی ابدی شادابیوں کے جلو میں ابھر ابھر کر نگاہوں کے سامنے آ رہے تھے۔ وحی خداوندی کی تنویریں قلب و نگاہ کے تاریک گوشوں میں بھرپور تابانیاں پیدا کر رہی تھیں۔

مفکر قرآن نے اس جنت کا جیتا جاگتا نقشہ سامنے رکھ دیا جو حضور رسالتمآبؐ والذین معہٗ کے مقدس ہاتھوں سرزمین عرب میں متشکل ہوئی تھی اور پھر اس کی وسعتوں نے نوع انسانی کے بہت بڑے حصے کو اپنی آغوش مرحمت میں لے لیا تھا۔ حاضرین کے دلوں نے برملا شہادت دی کہ لاریب! ابنِ آدم اس فردوس گم گشتہ کو صرف قرآنی نظام کے صدقے میں حاصل کر سکتا ہے اور اسی کی تشکیل سے اس کی سرگردانیاں، ابدی راحتوں اور خوش نصیبیوں سے ہم آغوش ہو سکتی ہیں۔ ہر دو خطبات کے دوران میں حاضرین کا جذب و انہماک قابل دید تھا۔ وہ قرآنی حقائق کی وجد آفرینیوں میں کھوئے ہوئے نظر آتے تھے اور جب خطاب کا اختتام سامنے آتا تو جذب مستی کے کیف میں وارفتہ وار پرویز صاحب کی طرف شوق مصافحہ میں بڑھنے لگتے۔ ان کی پُرشوق نگاہیں اس مفکرِ اسلام پر مرکوز ہوتیں جس کی کاوشِ فکر، قرآن کی دفینوں سے ایسے گہر ہائے آبدار کے گراں کے سامنے آئی اور ہر کاروانِ شوق میں بے دریغ لٹاتی چلی گئی۔

کیریکٹر کی تعمیر اور فردوس گم گشتہ کی بازآفرینی، آج انسانی زندگی کے یہی دو اہم ترین تقاضے ہی تو ہیں۔ اور باعث صد ناز ہے وہ مفکر قرآن جو خدا کی آخری کتاب کی روشنی میں ان تقاضوں کی بجا آوری میں علمبردار پیش رو ثابت ہو۔ پرویز صاحب اس فریضے سے سرخرو ہو کر سیالکوٹ سے رخصت ہوئے اور سینکڑوں دلوں میں قرآنی فکر کا وہ رت جلا گئے جو منزلِ انسانیت کا سراغ دیتا ہے۔ سیالکوٹ کے علمی حلقے ان گراں مایہ اجتماعات کو پُرخلوص جذبات کا خراجِ تحسین پیش کرتے رہیں گے اور ان کی یاد ان کے دلوں میں مدتوں معطر رہے گی۔ (انشاء اللہ)

لندن:- بزمِ لندن نے ۱۱ر فروری کو محترم گلزار محمد چغتائی کے دولت کدہ پر اپنی سالگرہ کی تقریب منائی۔ اس اجتماع میں دو پاکستانی سکالروں، محترم ایف۔ ایچ شاہ اور محترم فضل الرحمٰن کے علاوہ پروفیسر غلام فرید (گورنمنٹ کالج لاہور) اور ان کی بیگم صاحبہ نے بھی شرکت کی ——— پروفیسر موصوف طلوعِ اسلام کے خلاف بہت کچھ سن چکے تھے ——— اور اس اجلاس میں جب پرویز صاحب کا درسِ قرآن بذریعہ ٹیپ ریکارڈ سنایا گیا تو حاضرین اور بالخصوص پروفیسر صاحب پر تاثر کا ایک وجد آفریں سماں طاری تھا۔ کچھ ایسے حضرات بھی شریک اجتماع ہوئے

جن پر مخالفانہ پروپیگنڈے کا برا اثر تھا لیکن وہ بڑے خوشگوار تاثرات لے کر رخصت ہوئے۔
اس اجلاس میں بزم کی سال بھر کی کارگزاری اور آمد و خرچ کا گوشوارہ پیش کیا گیا۔ بزم کے قیام کے پس منظر پر بھی روشنی ڈالی گئی۔ اسلام سے دلچسپی رکھنے والے ایک امریکی صاحب نے انگریزی زبان کا لٹریچر طلب کیا جو انہیں مہیا کر دیا گیا۔ خاتمہ اجلاس پر محترم بیگم چغتائی نے دعوتِ افطار کا اہتمام کیا۔

عید کی تقریب پر جشن نزولِ قرآن کی سال گرہ محترم افضل جہانگیر صاحب کے دولت کدہ پر منائی جائے گی

کوئٹہ:- نمائندہ بزم کی کوئٹہ سے عدم موجودگی اور موسمی شدائد کے باوجود بزم کے اجتماع باقاعدگی سے جاری رہے۔ ان اجتماعات میں افہام تفہیم کا سلسلہ اس جذب و انہماک کی کیفیت لئے ہوتا کہ حاضرین نہ تو سردی کی شدت محسوس کرتے اور نہ اجلاس کی طوالت کو۔

بوریوالہ:- بزم کے اجلاس باقاعدگی سے ہو رہے ہیں اور قرآنی فکر کی اشاعت و تبلیغ کا سلسلہ بڑی کامیابی سے جاری ہے۔ اہلِ علم حضرات کی مانگ کے مطابق بہت سے پمفلٹ ہر ماہ تقسیم کئے جاتے ہیں۔

لائل پور:- بزم لائل پور کا ماہانہ اجلاس ہوا۔ آئندہ اجتماعات کو پوری طرح کامیاب بنانے پر غور کیا گیا۔ حاضر احباب نے یہ فریضہ اپنے ذمہ لیا کہ وہ دیگر اراکین اور احباب کو بھی ساتھ لایا کریں گے۔ آئندہ اجلاس سے درس مفہوم القرآن کا سلسلہ باقاعدگی سے جاری ہو جائے گا۔

راولپنڈی:- بزم راولپنڈی اپنے قابلِ فخر نمائندہ مرحوم چوہدری فیروز علی بھٹی کے سانحۂ موت پر سوگوار ہے۔ اسی سلسلے میں شاد صاحب کے مکان پر بزم کا ماتمی اجلاس ہوا جس میں مرحوم کی گرانقدر خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے دعائے مغفرت کی گئی اور ایک قرارداد تعزیت منظور کی گئی۔ محترم عزیز قریشی بزم کی نمائندگی کے لئے مرحوم کے جانشین منتخب ہوئے ہیں۔ مرحوم کی ذات ایک چلتی پھرتی بزم تھی۔ راولپنڈی میں انہی کے دم سے قرآنی فکر کا چراغ روشن رہا۔ خدا کرے کہ بزم اس نقصانِ عظیم کی تلافی کے قابل ہو سکے۔

آہ! چوہدری فیروز علی بھٹی!!

(جو گوہر کھو گیا ہے اس کو پا سکتے نہیں)

قلم یہ لکھتے ہوئے تھرتھرا رہا ہے کہ فیروز علی بھٹی ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے اور ان کے سانحۂ ارتحال نے بزم قرآنی کو ایک درخشندہ چراغ سے محروم کر دیا۔ یقیناً یہ سانحہ، ایک حادثہ جانکاہ سے کم نہیں۔ اٹکو ٹرو (راولپنڈی) کا ساقی جاں فروش تڑپتے ہوئے ارمانوں کے اس جلو میں ہم سے رخصت ہوا کہ اس غم کدہ قرآنی کی پوری فضا سوگوار اور اشک فشاں نظر آتی ہے۔ ہمارے کاروانِ شوق کا ان تھک ہم صفیر، قرآنی فکر کا مخلص شیدائی اور بزم راولپنڈی کا دل باختہ نقیب اس ناگہانی انداز میں بزم سے رخصت ہوا کہ جادۂ شوق پر بڑھتے ہوئے قدم لرزش میں آ گئے اور جادہ پیماؤں کے دل خون ہو کر رہ گئے۔ نگاہ شوق بھری بزم میں اس ہمنفس کو اور گرم جوش رفیق کو تلاش کرے گی لیکن وہ شگفتہ چہرہ اب کہیں نظر نہ آئے گا۔ اس کی گرانمایہ رفاقت کی یاد عہد رفتہ کی گرم جوشیوں کا سنہری ورق بن کر ہماری تاریخ میں محفوظ ہو جائے گی اور اس کے جوششِ کردار کی داستانیں ہمارے کاروانِ شوق کی امنگوں اور عزائم کو نئی حرارت عطا کرتی رہیں گی۔

مرحوم بھٹی جب تک زندہ رہے، اپنے رفقاء سمیت قرآنی فکر کی اشاعت و تبلیغ میں سرگرم عمل رہے، اور اب جبکہ موت نے ہمیں ان کی رفاقت سے محروم کر دیا ہے تو ان کی سعی و کاوش ایک نشانِ راہ کا کام دیتی رہے گی کسے معلوم تھا کہ اس پیکرِ ایثار کی ناگہانی موت، اٹکو ٹرو کے حیات آفریں ہنگاموں کو سسکیوں میں بدل دے گی، اور جس غمکدۂ قرآنی سے شب و روز حیات نو کی کرنیں پھوٹتی رہیں، اسے اس رونقِ محفل کا جنازہ اٹھتے بھی دیکھنا پڑے گا۔ بزمہائے طلوعِ اسلام آج اسی حادثہ سے دوچار ہیں ——— خدا کرے کہ یہ سانحۂ غم ایک عارضی حادثہ ثابت ہو اور اس کی تلافی کا امکان جلد از جلد وجود پذیر ہو!

موت و حیات کی ان انقلاب آفرینیوں میں طلوعِ اسلام کا کاروانِ شوق یقیناً پورے عزم و ثبات اور صبر و ضبط سے اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھتا رہے گا۔ یقیناً وہ صبحِ بہار جلوہ بار ہو کر رہے گی جس کی نورانی کرنیں جنتِ ارضی کی بساط بچھائیں گی۔ یہ سب کچھ ہو کر رہے گا لیکن حیف! کہ مرحوم ہستی کی بے تاب آرزوئیں ظہورِ نتائج کی اس ساعتِ سعید کی جھلک نہ دیکھ سکیں گی۔

آئیں گی بہاریں بھی گلشن بھی ہرے ہوں گے
وہ رنگ کہاں ہوگا اے لالۂ صحرائی!

اچھا ہمارے رفیق عزیز! تمہاری روحِ پرفتوح کو ادارہ طلوعِ اسلام کا مخلصانہ سلام۔ خدا تمہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل سے بہرہ ور فرمائے۔

فصلِ گل تربت پہ تیری پھول برساتی رہے
جو سنی کیمپ سے رحمت کی ہوا آتی رہے

(ادارہ طلوعِ اسلام)

اظہارِ تعزیت

محترم نور محمد صاحب نمائندہ بزم طلوعِ اسلام چنیوٹ (نفیس شعائی ہاؤس رجسٹرڈ چنیوٹ) کی والدہ ماجدہ ۱۲ فروری کو انتقال کر گئیں۔ محترم مذکور کا خاندان اسی شفیق والدہ اور ایک بھائی تک محدود تھا۔ اسی والدہ کی شفقت سے دیکھے قرآنی فکر کے اس پرجوش مبلغ کی زندگی کا سہارا تھی۔ افسوس کہ بزمِ قرآنی کے یہ سرگرم رفیق اس سہارے سے بھی محروم ہو گئے۔ اس جانکاہ صدمہ میں ہم نور محمد صاحب کے غم میں شریک ہیں اور ان سے اظہارِ تعزیت کرتے ہوئے ہماری دعا ہے کہ ربِ جلیل مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ اور غمزدگان کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ اس المیہ کو صبر کے ساتھ برداشت کر سکیں۔

(ادارہ طلوعِ اسلام)

طلوعِ اسلام کنونشن

طلوعِ اسلام کنونشن کا سالانہ اجتماع آئندہ اپریل میں ہوگا۔ اس سلسلہ میں ضروری پروگرام اور ہدایات بذریعہ ڈاک بزموں کو ارسال کی جائیں گی۔ (ادارہ طلوعِ اسلام)

لغات القرآن

سالہا سال کی دیدہ ریزیوں اور تفہیمی کاوشوں کا جگمگاتا شاہکار

جس کا مدتوں سے انتظار تھا

قرآنی معارف و مطالب کا بصیرت افروز انسائیکلوپیڈیا

قرآن کے الفاظ ـــ قرآن کے تصورات ـــ قرآن کی تعلیم

کتاب کے حصہ اول میں عربی زبان کے مبادیات اور مفردات بھی شامل ہیں جن کی بدولت عربی زبان سے ناآشنا حضرات بھی قرآنی مفہوم و مطالب سے بخوبی مستفید ہو سکتے ہیں۔

ٹائپ کی حسین و دلآویز طباعت ـــ بہتر سفید کاغذ ـــ پائیدار، سنہری دیدہ زیب جلد

قیمت جلد اول پندرہ روپے جلد دوم پندرہ روپے جلد سوم پندرہ روپے۔ جلد چہارم بارہ روپے۔

پورا سیٹ پچاس روپے میں مل جائیگا۔

فہرست کتب ایک کارڈ بھیج کر مفت طلب فرمائیے۔

ملنے کا پتہ:ـ

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ

۲۷-بی ـــ شاہ عالم مارکیٹ ـــ لاہور

نقد و نظر

"تلبیسِ ابلیس" شیطان کس کس بھیس میں لوگوں کو گمراہ کرتا ہے' یہ ہے امام ابن الجوزیؒ کی اس کتاب کا موضوع جس کا اردو ترجمہ نور محمد، کارخانہ تجارت کتب کراچی نے شائع کیا ہے۔ کتاب متوسط تقطیع کے قریب پانچسو صفحات پر مشتمل ہے اور مجلد کی قیمت دس روپے ہے۔ اس میں پہلے ان بہتر فرقوں کا ذکر ہے جن میں اُمتِ مسلمہ بٹ گئی تھی۔ اس میں ابن الجوزیؒ نے اپنے فرقے کو چھوڑ کر باقی سب فرقوں کو باطل قرار دیا ہے (یہی کچھ ہر مصنف کرتا ہے) یہ فرقے اپنے اپنے عقائد میں کس درجہ متشدد تھے اس کا اندازہ ذیل کے دو چار واقعات سے لگائیے جنہیں مصنف نے درج کتاب کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> معمرؒ کہتے ہیں کہ طاؤسؒ (تابعی) بیٹھے تھے اور ان کے پاس ان کا بیٹا بیٹھا تھا۔ اتنے میں ایک شخص فرقہ معتزلہ میں سے آیا اور ایک شرعی بات میں بداعتقادی کی گفتگو کرنے لگا۔ طاؤسؒ نے اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں دے لیں اور بیٹے سے کہا کہ اے فرزند! تو بھی اپنی دونوں انگلیاں اپنے کانوں میں دے لے تاکہ تو اس کی گفتگو کچھ نہ سنے۔ اس لئے کہ یہ دل ضعیف ہے۔ پھر کہا کہ اے فرزند! خوب زور سے کان بند کر لے۔ پھر برابر یہی کہتے رہے کہ اے فرزند خوب زور سے کان بند کئے رہ یہاں تک وہ معتزلی اٹھ کر چلا گیا۔
>
> عیسیٰ بن علی الضقی نے کہا کہ ایک شخص ہمارے ساتھ ابراہیمؒ کی خدمت میں جایا کرتا تھا پھر ابراہیمؒ کو خبر ملی کہ وہ شخص مرجیہ کے گروہ میں شامل ہو گیا ہے تو ابراہیمؒ نے اس سے فرمایا کہ اب جو تو ہمارے پاس سے جاتا ہے تو پھر ہمارے یہاں نہ آنا۔ (صفحہ ۱۳)

ایک اور واقعہ۔

سعید الکربزیؒ نے بیان کیا کہ سلیمان التیمیؒ بیمار ہوئے تو حالت مرض میں بہت کثرت سے رونا شروع کیا۔ آخر آپ سے عرض کیا گیا کہ یا حضرت آپ روتے کیوں ہیں، کیا موت سے اس قدر گھبراہٹ ہے؟ فرمایا کہ نہیں۔ بلکہ بات یہ ہے کہ ایک روز میرا گزر ایک بدعتی کی طرف ہوا تھا جو تقدیر سے منکر اور مخلوق کو قادر کہتا تھا۔ میں نے اس بدعتی کو سلام کر لیا تھا۔ تو اب مجھے سخت خوف ہے کہ میرا پروردگار کہیں مجھ سے اس کا حساب نہ کرے۔ (ص۱۵)

عباسیوں کے زمانے میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا تھا کہ قرآن کریم حادث (مخلوق) ہے یا قدیم۔ اس سلسلہ میں ابن جوزیؒ نے لکھا ہے کہ

عمرو بن دینارؒ سے روایت ہے کہ میں نے ۷۰ اصحاب رسول اللہ کو پایا جو فرماتے تھے کہ جو کوئی کہے کہ قرآن مخلوق ہے، وہ کافر ہے۔ امام مالک بن انسؒ نے کہا کہ جو کوئی قرآن کو مخلوق کہے اس سے توبہ کرائی جائے۔ . . . . . (ص۱۱۷)

قرآن کریم نے مسلمانوں کے متعلق کہا تھا کہ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا۔ (۳/۱۰۳) "تم خدا کی اس نعمت کو یاد کرو کہ جس سے اس نے تمہیں نوازا ہے تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس نے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کی الفت پیدا کر دی اور یوں تم خدا کی اس نعمت کی رو سے بھائی بھائی ہو گئے"۔ ایسے بھائی جن کے متعلق کہا کہ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (۴۸/۲۹) "دشمنوں کے مقابلہ میں چٹان کی مانند سخت۔ اور آپس میں نہایت ہمدرد"۔ اور واضح الفاظ میں یہ وعید بیان کر دی کہ وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا (۴/۹۳) "جو جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے۔ وہ اسی میں رہے گا۔ اس پر اللہ کا غضب اور لعنت ہو گی۔ اور اس کیلئے خدا سخت عذاب تیار کرے گا"۔ اسی جماعتِ مسلمین کی فرقہ بندی نے یہ حالت کر دی کہ اگر ایک مسلمان نے دوسرے مسلمان کو سلام کہہ دیا تو وہ ایسا گنہگار ہو گیا کہ اسے اپنی نجات کی طرف سے خطرہ لاحق ہو گیا۔ وہ بات کرنے کے لئے آیا تو کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ اور ذرا ذرا سے عقیدہ کے اختلاف پر ایک دوسرے کے قتل کے فتوے صادر ہونے لگ گئے۔ علامہ ابن جوزیؒ نے اپنی کتاب چھٹی صدی ہجری میں لکھی تھی۔ اگر امت مرحومہ کی تیرہ سو سال کی تاریخ سامنے رکھی جائے تو نظر آجائے گا کہ اس فرقہ پرستی نے کیا کیا قیامتیں برپا کی ہیں۔ اور سب سے بڑی قیامت یہ کہ جس کسی نے فرقہ بندی کے خلاف آواز بلند کی ہے اسے دین اور امت کا سب سے بڑا دشمن ٹھہرایا گیا ہے۔ کیا کسی قوم کی اس سے بڑی بدقسمتی کچھ اور بھی ہو سکتی ہے؟

۲۔ ابن جوزیؒ نے، شیطان کے مکر و فریب کی مثالیں پیش کرنے کے سلسلے میں عجیب عجیب انداز کے قصے بیان کئے ہیں۔ مثلاً

سالم بن عبداللہؒ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت نوحؑ کشتی میں سوار ہوئے تو اس میں ایک انجان بڈھے کو دیکھا۔ حضرت نوحؑ نے اس سے کہا تو یہاں کیوں آیا۔ اس نے جواب دیا کہ میں تمہارے یاروں کے دلوں پر قابو کرنے آیا ہوں۔ تاکہ اُن کے دل میرے ساتھ ہوں اور جسم تمہارے ساتھ۔ حضرت نوحؑ نے کہا کہ اے خدا کے دشمن نکل جا۔ ابلیس بولا کہ پانچ چیزیں ہیں جن سے میں لوگوں کو ہلاک کرتا ہوں۔ اُن میں سے تین تجھے بتاؤں گا اور دو تم سے نہ کہوں گا۔ حضرت نوحؑ کو وحی ہوئی کہ اس سے کہو تین کی مجھے حاجت نہیں۔ وہ دو بیان کرے۔ ابلیس نے کہا انہی دو سے میں آدمیوں کو ہلاک کرتا ہوں۔ اور ان کو کوئی جھوٹ نہیں کہہ سکتا۔ ایک حسد کہ اسی کی وجہ سے میں ملعون ہوا۔ اور شیطان مردود کہلایا۔ دوسری حرص، کہ آدم کے لئے تمام جنت مباح کر دی گئی۔ میں نے حرص کی بدولت ان سے اپنا کام نکال لیا۔

ہادی نے کہا کہ ابلیس حضرت موسیٰؑ سے ملا۔ اور کہنے لگا اے موسیٰ! اللہ تعالیٰ نے تم کو اپنی رسالت کے لئے برگزیدہ فرمایا ہے۔ اور تم سے ہم کلام ہوا ہے۔ میں بھی خدا کی مخلوق میں شامل ہوں۔ اور مجھ سے ایک گناہ سرزد ہو گیا۔ اب میں توبہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ میرے پروردگار عزوجل کے پاس میری سفارش کیجئے کہ میری توبہ قبول کرے۔ حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ حکم ہوا کہ اے موسیٰ ہم تمہاری حاجت برلائے۔ پھر حضرت موسیٰؑ شیطان سے ملے اور کہا کہ مجھے ارشاد ہوا ہے کہ تو حضرت آدمؑ کی قبر کو سجدہ کرے۔ تو تیری توبہ قبول ہو۔ شیطان نے انکار کیا۔ اور غصے میں آکر کہنے لگا کہ جب میں نے آدمؑ کو ان کی زندگی میں سجدہ نہ کیا تو اب مرنے پر کیا سجدہ کروں گا۔ پھر شیطان نے کہا کہ اے موسیٰ تم نے جو اپنے پروردگار کے پاس میری سفارش کی ہے اس لئے تمہارا مجھ پر ایک حق ہے۔ تم مجھ کو تین حالتوں میں یاد کیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم کو ان تین وقتوں میں ہلاک کر دوں۔ ایک تو غصہ کے وقت مجھ کو یاد کرو کیونکہ میرا وسوسہ تمہارے دل میں ہے۔ اور میری آنکھ تمہاری آنکھ میں ہے۔ اور میں تمہارے رگ و پوست میں خون کی طرح دوڑتا پھرتا ہوں۔ دوسرے جہاد و غزا کی حالت میں میرا خیال کیا کرو کیونکہ میں فرزند آدم کے پاس اس وقت جاتا ہوں جب وہ کفار سے مقابلہ کرتا ہے۔ اور اس کے بال بچے، بی بی، گھر والے یاد دلاتا ہوں یہاں تک وہ جہاد سے بھاگ کھڑا

ہوتا ہے تیسرے غیر محرم عورت کے پاس بیٹھنے سے بچتے رہو کیونکہ میں تمہارے پاس اس کا قاصد ہوں اور اس کے پاس تمہارا پیامبر ہوں۔

سعید بن مسیبؒ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو مبعوث نہیں فرمایا مگر یہ کہ شیطان اس بات سے ناامید نہیں ہوا کہ اس کو عورتوں کے ذریعہ ہلاک کر دے۔

فضیل بن عیاضؒ کہتے ہیں ہم کو اپنے بعض مشائخ سے یہ حدیث پہنچی کہ ابلیس حضرت موسیٰؑ کے پاس گیا۔ اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے باتیں کرتے تھے۔ شیطان سے فرشتے نے کہا دلے ہو تجھ پر اس حالت میں کہ حضرت موسیٰؑ اپنے پروردگار سے باتیں کر رہے ہیں تو اُن سے کیا خواہش رکھتا ہے۔ جواب دیا کہ میں اُن سے وہی خواہش رکھتا ہوں جو اس کے باپ آدمؑ سے بہشت میں چاہا تھا۔

عبدالرحمٰن بن زیادؒ سے روایت ہے کہ ایک وقت حضرت موسیٰؑ کسی مجلس میں بیٹھے تھے۔ اتنے میں ابلیس ان کے پاس آیا اور اس کے سر پر کلہ دار ٹوپی تھی جس میں طرح طرح کے رنگ تھے جب حضرت موسیٰؑ سے قریب ہوا تو ٹوپی اتار ڈالی۔ اور سامنے رکھ لی۔ پھر آکر سلام علیک کیا۔ حضرت موسیٰؑ نے کہا تو کون ہے۔ بولا میں ابلیس ہوں۔ موسیٰؑ بولے خدا تجھے زندہ نہ رکھے۔ تو کیوں آیا۔ کہنے لگا میں آپ کو سلام کرنے کے لئے آیا تھا کیونکہ آپ کا مرتبہ اور آپ کی منزلت اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے پوچھا کہ وہ کیا چیز ہے جو میں نے تیرے سر پر دیکھی تھی۔ کہا کہ اس سے اولادِ آدم کے دلوں کو لبھا لیتا ہوں۔ پوچھا بھلا یہ تو بتا کہ وہ کونسا کام ہے جس کے مرتکب ہونے سے تو انسان پر غالب آجاتا ہے۔ جواب دیا کہ جب آدمی اپنی ذات کو بہتر سمجھنے لگتا ہے اور اپنے عمل کو بہت کچھ خیال کرتا ہے اور اپنے گناہوں کو بھول جاتا ہے اے موسیٰ میں تم کو تین باتوں سے ڈراتا ہوں۔ ایک تو غیر محرم عورت کے ساتھ تنہائی میں نہ بیٹھنا کیونکہ جب کوئی شخص غیر محرم کے ساتھ خلوت میں ہوتا ہے تو اس کے ساتھ میں بذاتِ خود ہوتا ہوں میرے ساتھی نہیں ہوتے یہاں تک کہ اس عورت کے ساتھ اس کو فتنے میں ڈال دیتا ہوں۔ دوسرے اللہ تعالیٰ سے جو عہد کرو اس کو پورا کیا کرو۔ کیونکہ جب کوئی اللہ تعالیٰ سے عہد کرتا ہے تو اس کا ہمراہی اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر میں خود ہوتا ہوں یہاں تک کہ اس شخص اور وفاءِ عہد کے درمیان حائل ہو جاتا ہوں۔ تیسرے جو صدقہ نکالا کرو اُسے جاری کر دیا کرو

کیونکہ جب کوئی صدقہ نکالتا ہے اور اُسے جاری نہیں کرتا تو میں اس صدقہ اور اس کے پورا کرنے کے بیچ میں حائل ہو جاتا ہوں۔ اور یہ کام بذاتِ خود کرتا ہوں۔ اپنے ساتھ والوں سے نہیں لیتا۔ یہ کہہ کر شیطان چل دیا۔ اور تین بار کہا ہائے افسوس موسیٰ نے وہ باتیں جان لیں جن سے بنی آدم کو ڈرائے گا۔

قریش کے دو بتوں کے متعلق لکھا ہے۔

مصنفؒ نے کہا کہ مشرکوں کے بتوں میں سے اساف اور نائلہ بھی تھے۔ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ اساف و نائلہ قبیلہ جرہم میں سے ایک مرد و عورت تھے۔ ان کو اساف بن یعلیٰ اور نائلہ بنت زید کہتے تھے۔ یہ دونوں جرہم کی نسل سے تھے۔ اور دونوں کا عشق زمین یمن سے شروع ہوا تھا۔ پھر نائلہ کے ساتھ حج کو آئے اور ایک رات دونوں خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تو وہاں خالی گھر پایا۔ کوئی آدمی نہ تھا۔ اس اساف نے نائلہ سے بدکاری کی تو مسخ ہو کر پتھر ہو گئے۔ صبح کو لوگوں نے ان کو مسخ پا کر خانہ کعبہ سے نکال باہر قائم کیا۔ بعد ازاں قریش و خزاعہ اور دیگر عرب نے جو حج کو آئے تھے ان دونوں کو پوجنا شروع کیا۔ (صفحہ ۷۰)

سو کتاب میں ایک عنوان ہے "ہماری امت مسلمہ پر عقائد و دیانات میں تلبیس ابلیس کا بیان"۔ اس کے تحت ابن جوزیؒ لکھتے ہیں۔

مصنف نے کہا کہ ابلیس دو طریقوں سے اس امت کے عقائد میں داخل ہوا (ایک) باپ دادوں کی تقلید (دوم) ایسی بات میں خوض کرنا جس کی تہہ نہیں مل سکتی ہے یا غور کرنے والا اس کی تہہ کو نہیں پہنچ سکتا ہے۔ پس ابلیس نے دوسری قسم کے لوگوں کو طرح طرح کے خلط ملط میں ڈال دیا۔ رہا طریق اول (باپ دادوں کی تقلید) تو ابلیس نے ان مقلدوں پر یہ دکھایا کہ دلیلیں کبھی مشتبہ ہوتی ہیں اور راہ صواب مخفی ہو جاتی ہے۔ تو تقلید کر لینا سلامتی راہ ہے۔ اس مادہ تقلید میں بکثرت مخلوق گمراہ ہوئی۔ اور عموماً اسی سے لوگوں پر تباہی آئی۔ بیشک یہود و نصاریٰ نے اپنے باپ دادوں کی اور اپنے پادریوں کی اور پوپوں کی تقلید کی۔ اور اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت والے بھی اسی قسم کی تقلید میں پڑے ہوئے تھے۔ واضح ہو کہ جس دلیل سے انھوں نے تقلید کی تعریف کی۔ اسی سے اس کی مذمت متحقق ہے کیونکہ جب دلیلیں مشتبہ ہیں اور ثواب مخفی ہے۔ تو ضرور تقلید کو چھوڑ دینا چاہیئے تاکہ ضلالت میں نہ پڑ جائے۔ اور بیشک اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں

کی مذمت فرمائی ہے جو اپنے باپ دادوں کی تقلید میں پڑے تھے۔ بقولہ تعالیٰ قَالُوْا اِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ الآیۃ۔ یعنی کفار نے کہا نہیں بلکہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک طریقہ پر پایا اور ہم اُن ہی کے قدم کی اقتدا کرتے ہیں۔ پیغمبر نے کہا کیا تم تقلید ہی کئے جاؤ گے اگرچہ میں اُس سے بہتر ہدایت لایا ہوں جس پر تم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے۔ یعنی کیا ایسی صورت میں بھی تم اُن ہی گمراہوں کی پیروی کرو گے۔ وبقولہ تعالےٰ اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّيْنَ الآیۃ۔ یعنی کافروں نے اپنے بزرگوں کو گمراہ پایا تھا۔ تو یہ بھی ان کے نشانِ قدم پر دوڑے جاتے ہیں۔ مصنفؒ نے کہا کہ یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ مقلد جس بارہ میں تقلید کی اس میں اعتماد پر نہیں ہوتا۔ اور تقلید کرنے میں عقل کی منفعت بھی زائل کرنا لازم ہے۔ اس لئے کہ عقل تو اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ غور و تامل کرے۔ اور جس شخص کو خدا نے شمع دی ہو جس سے روشنی ہوتی ہے وہ اگر شمع کو بجھا دے اور اندھیرے میں چلے تو اس کی یہ حرکت قبیح ہے۔ واضح ہو کہ اکثر اصحاب مذاہب کے ذہن میں جو شخص بھی بڑی شان کا متصور ہوتا ہے جو کچھ اس نے کہا اس کو بے سوچے سمجھے مانتے اور اس کی پیروی کرتے ہیں۔ اور یہی عین گمراہی ہے۔ کیونکہ نگاہ درحقیقت بات پر جانی چاہیئے، بات کہنے والے پر نہیں۔

۴۔ فائدوں پر تلبیس کے زیر عنوان لکھا ہے

چنانچہ تم دیکھو گے کہ اکثر ایک شخص مسجد کا امام ہے اور لوگ دور دور سے قراءت کے واسطے اس کی طرف سفر کرتے ہیں لیکن وہ ایسے چند احکام بھی نہیں جانتا کہ جن سے نماز فاسد ہوتی ہے اور بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ جب وہ موضع عام ہو گیا تو اس کی چاٹ اس کو ابھارتی ہے کہ وہ بعض واقعات میں عالم بن کر فتویٰ دیدیتا ہے۔ اگرچہ (اس طرح فتویٰ دینا) مذہباً جائز نہیں ہوتا لیکن اس کو جہالت کی آنکھ سے نہیں سوجھتا کہ یہ کس کا مرتبہ ہے۔ اگر یہ لوگ غور کرتے تو جان لیتے کہ قراءت سے مقصود یہ ہے کہ قرآن مجید حفظ کرے ٹھیک مخرج سے۔ پھر اس کو سمجھے۔ پھر اس پر عمل کرے۔ پھر ایسی چیز پر متوجہ ہو جو معارف قرآن میں سے اس کے نفس کی اصلاح اور اس کے اخلاق کو پاک کرے۔ پھر شرع کے دیگر اہم امور کی طرف متوجہ ہو۔ اور کھلا خسارہ یہی ہے کہ جس امر کو زیادہ اہم جانے اس کو چھوڑ کر دوسرے کام میں مشغول ہو۔ حسن بصریؒ نے فرمایا کہ قرآن اس لئے اترا تھا کہ اس پر عمل کیا جائے۔ پھر لوگوں نے اب اس کی

تلاوت کو کام بنا لیا یعنی لوگ فقط تلاوت کے ہو رہے۔ اور اس پر عمل کرنا چھوڑ دیا۔

آگے چل کر لکھا ہے۔

ازاں جملہ یہ کہ قراء میں ایسے لوگ ہیں جو کثرتِ قراءت سے ممتاز ہیں۔ میں نے ان حافظوں کے بعض شائخ کو دیکھا کہ وہ لوگوں کو جمع کرتے اور ایک جید شاگرد کو منتخب کرتے۔ وہ تمام دن گری میں تین ختم پڑھتا پھر اگر اس نے پورے کر لئے تو ہر طرف سے واہ واہ ہوئی۔ عوام وہاں جمع ہوتے ہیں اور اس کی تعریف کرتے ہیں۔ اور اگر تین ختم اس بڑے دن میں نہ ہو سکے تو اس پر عیب لگاتے ہیں۔ ابلیس ان کو دکھلاتا ہے کہ یہ کثرتِ قراءت بڑے ثواب کی بات ہے۔ اور یہی اس کی تلبیس ہے۔ اس لئے کہ قراءت تو خالص اللہ تعالیٰ کے واسطے چاہیئے نہ کہ لوگوں کی تعریف کے لئے اور وہ بھی آہستگی سے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے لتقرأہ علی الناس علیٰ مکث تاکہ اے محمد تو اس کو لوگوں پر ٹھیر ٹھیر کے پڑھے۔ اور فرمایا وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا۔ قرآن کو ترتیل سے تلاوت کرو۔

۵۔ واعظوں پر تلبیس کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

منجملہ آفات کے یہ ہے کہ ان میں ایک قوم (ہندوستان میں سوائے شاذ و نادر کے عموماً سب) دلچسپی اور رغبت دلانے کے لئے اور خوف و دہشت دلانے کی غرض سے حدیثیں بناتی ہے۔ ابلیس نے ان پر یہ رچا دیا ہے کہ تم تو حدیثیں اس لئے بناتے ہو کہ لوگوں کو نیکی پر آمادہ کرو۔ اور بدی سے روکو۔ اور شیطان نے ان جاہلوں پر یہ شبہ ڈالا کہ شریعت ناقص ہے تمہاری اس جھوٹی کارستانی کی محتاج۔ پھر یہ بھول گئے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو کوئی جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھے وہ دوزخ میں اپنا ٹھکانا بنا وے۔

ازاں جملہ یہ لوگ اپنے سریلے کلام میں وہ چیزیں ملاتے ہیں جو نفس کا جوش ابھاریں اور دلوں میں سرور لائیں۔ تو اپنی باتوں کو رنگین کرتے ہیں۔ چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ اُس میں عشقیہ اشعار اور غزلیں پڑھتے ہیں۔ ابلیس نے ان پر یہ تلبیس رچائی کہ تم اللہ تعالیٰ کی محبت کا اشارہ کرتے ہو۔ اور یہاں یہ خوب معلوم ہے کہ عوام جو ان کی مجلس میں بھرے پڑے ہیں ان کے دلوں میں جوشِ شہوت بھرا ہوا ہے۔ جو اس تازیانہ سے ابل پڑتا ہے تو یہ واعظ خود گمراہ اور گمراہ کرنے والا ہے۔

ازاں جملہ بعضے واعظ بناوٹ سے وجد اور خشوع ظاہر کرتے ہیں۔ اگرچہ دل میں بھی ہو تو اس سے

بہت زیادہ بتلاتے ہیں۔ اور جس قدر جماعت کی کثرت ہو اسی قدر بناوٹ زیادہ ہوتی ہے۔ تو نفس میں جو بڑھتی خشوع در رونا موجود ہوتا ہے وہ اس کو رائیگاں کرنے میں بخل نہیں کرتا۔ پس ان میں سے جس نے یہ جھوٹ بناوٹ کی وہ آخرت میں خوار اور خراب ہوا اور جو سچا ہے وہ ریاکاری کی میل سے نہ بچا۔

بعض واعظین عجیب و غریب حرکات کرتے ہیں۔ جن کا نتیجہ یہ کہ قرآن کو ایک نئی راگنی کے لہجے میں پڑھنے لگتے ہیں۔ یہ نئی راگنی انھوں نے آجکل گانے کے مشابہ نکالی ہے تو یہ مکروہ ہی نہیں بلکہ صریح حرام سے زیادہ قریب ہے۔ پس اس راگنی کی قراءت سے قاری کو سرور ہوتا ہے اور واعظ اس کے ساتھ ہاتھوں کی دستک اور پاؤں کی ٹھوکر لگا کر غزلیں پڑھتا جاتا ہے۔ جیسے مستانہ لوگ کرتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ عوام کی طبیعت اُمنگ پر آجاتی ہے اور اُن کے شہوانی نفوس جوش کھاتے ہیں۔ عورتیں اور مرد آوازیں لگاتے ہیں اور کپڑے پھاڑتے ہیں۔ کیونکہ جملہ نفوس میں جو خواہشِ نفسانی و قوت شہوانی حیوانی دبی ہوئی ہیں وہ اس جلسہ میں ابھر آتی ہیں۔ پھر جب یہاں سے یہ عورتیں اور مرد باہر نکلتے ہیں تو کہتے جاتے ہیں کہ جلسہ تو بہت خوب ہوا۔ اور خوبی سے اشارہ انھیں حرکات و امور ناشائستہ کی طرف ہے جو شرعاً جائز نہ تھے۔

۶۔ ایک عنوان ہے "محدثین پر تلبیس ابلیس کا بیان"۔ اس سلسلہ میں لکھا ہے۔

بغداد میں ایک طالب علم حدیث داخل ہوا۔ وہ شیخ کو لے جا کر رقہ میں بٹھلاتا تھا یعنی اس باغ میں جو دجلہ کے دونوں کنارے چلا گیا ہے اور شیخ کو حدیث سناتا تھا پھر اپنے مجموعے میں یوں لکھتا کہ مجھ سے رقہ میں فلاں فلاں شیخ نے حدیث بیان فرمائی۔ اس سے وہ لوگوں کو وہم میں ڈالتا کہ رقہ سے وہ شہر مراد ہے جو ملکِ شام کی طرف ہے۔ تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ اس محدث نے طلبِ حدیث میں دور دراز سفر کئے ہیں۔ اسی طرح اپنے شیخ کو لے جا کر نہر عیسیٰ و فرات کے درمیان بٹھلا کر حدیث سناتا اور مجموعہ میں لکھتا کہ مجھ سے فلاں شخص نے وراء النہر میں یہ حدیث بیان کی تاکہ لوگ وہم میں پڑیں کہ اس نے طلبِ حدیث میں خراسان کے پار ہو کر ماوراء النہر میں یہ حدیث سنی۔ اور یوں لکھتا کہ مجھ سے فلاں نے میرے سفر دوم میں اور فلاں نے میرے سفر سوم میں حدیث فرمائی۔ تاکہ لوگ جانیں کہ طلبِ علم میں اس نے کس قدر تعب اٹھایا ہے۔

لیکن اس طالبِ علم کو برکت حاصل نہ ہوئی۔ بلکہ طالب علمی ہی کے زمانے میں مر گیا۔

اسی سلسلے میں آگے چل کر لکھتے ہیں۔

منجملہ تلبیس ابلیس کے علماء محدثین پر یہ ہے کہ موضوع حدیث روایت کرتے ہیں بدون اس کے کہ اس کو موضوع ظاہر کریں۔ اور یہ ان کی طرف سے شرع کا جرم ہے۔ اس سے ان کی غرض یہ ہے کہ ان کی حدیثیں رائج ہوں اور یہ مشہور ہو کہ یہ محدث کثیر الروایت ہیں۔ (ص ۱۵۹)

نیز یہ کہ

منجملہ آفات کے یہ ہے کہ ان میں ایک قوم ہند دستان میں سوائے شاذ و نادر کے عموماً سب) دلچسپی اور رغبت دلانے کے لئے اور خوف و دہشت دلانے کی غرض سے حدیثیں بناتی ہے ابلیس نے ان پر یہ رچا دیا ہے کہ تم تو حدیثیں اس لئے بناتے ہو کہ لوگوں کو نیکی پر آمادہ کرو اور بدی سے روکو۔ (ص ۱۶۹)

۷۔ فقہا کے متعلق لکھا ہے۔

منجملہ تلبیس ابلیس کے جو فقہا پر ڈالی یہ ہے کہ یہ لوگ امیروں و بادشاہوں سے ملتے اور ان کے پاس گھسے رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ مداہنت کرتے اور ان کی بداعمالی پر باوجود قدرت کے بھی ان کی خوشامد کے لئے انکار نہیں کرتے۔ بلکہ بعض اوقات اُن کے واسطے ایسے امور کی اجازت دیتے ہیں جو اُن کو جائز نہیں ہو سکتے ہیں تاکہ اُن کے مال دنیا دی سے کچھ یہ بھی حاصل کر لیں۔ اس قبیح حرکت سے تین شخصوں کے لئے فساد کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ (اول) وہ تو خود اس امیر کے حق میں ہے کہ وہ زعم کرتا ہے کہ اگر میں راہِ صواب پر نہ ہوتا تو فقیہ میرے طریقہ پر ضرور انکار کرتا اور میں کیونکر مصیب نہ ہوتا۔ حالانکہ فقیہ میرا مال کھاتا ہے۔ (دوم) عوام پر فساد کی راہ یہ ہے کہ اس رئیس کے حق میں کہتے ہیں کہ یہ بہت اچھا امیر ہے۔ اس کا مال بھی پاکیزہ ہے۔ اور خود بھی بزرگ ہے۔ اس کے افعال بھی اچھے ہیں۔ دیکھو فلاں فقیہ اس کے پاس ہمیشہ گھسا رہتا ہے۔ (سوم) اس فقیہ پر فتنہ عظیم یہ ہوتا ہے کہ اس نے اپنے دین کو دنیا کے واسطے بگاڑ دیا۔

۸۔ اہلِ لغت و ادب کے علماء و متعلمین کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ لوگ ایسے علوم و فنون میں اپنی عمریں ضائع کر دیتے ہیں جو خود مقصود بالذات نہیں ہیں۔ اور شیطان ان کے دل میں یہ خیال ڈال دیتا ہے کہ تم لوگ اسلام کے علما ہو۔

اس لئے کہ یہ نحو و لغت اسلامی علوم ہیں۔ (صـ۱۹۳)

۹۔ عابدوں کے سلسلہ میں لکھا ہے۔

ابلیس نے بہت سے نمازیوں پر حروف کے مخارج میں تلبیس ڈالی وہ چنانچہ تم بعض کو دیکھو گے کہ وہ الحمد الحمد مکرر سہ کرر کہتا ہے حتیٰ کہ وہ اس کلمہ کے بار بار اور مکرر سہ کرر کہنے کی وجہ سے نماز کے ادب سے خارج ہو جاتا ہے اور کبھی نمازی پر تشدید کے ٹھیک نکالنے میں تلبیس ڈالتا ہے۔ اور کبھی غیر المغضوب کے ضاد نکالنے میں تلبیس کرتا ہے۔ میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ المغضوب کہتا تھا تو نہایت تشدد کی وجہ سے ضاد نکالنے کے ساتھ تھوک نکل پڑتا تھا۔ حالانکہ مراد تو حرف کو صحیح نکالنا ہوتا ہے لیکن ابلیس اُن لوگوں کو ایسے فضولیاتِ زائد کی طرف اس لئے لے جاتا ہے کہ تلاوت میں معانی کی فکر سے خارج ہو کر ایسے مبالغات میں پڑ جائیں۔

۱۰۔ حاجیوں کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ "ابلیس نے بہت سے حج کو جانے والوں پر تلبیس ڈالی کہ نمازیں چھوڑتے جاتے ہیں۔ اور فروخت کریں تو کم تولتے ہیں۔ ان کا گمان یہ ہے کہ حج ہمارے سب گناہ دور کر دے گا۔ (صـ۲۰۳)

کتاب کا سب سے بڑا حصہ "صوفیوں پر تلبیس ابلیس" کے عنوان پر ہے۔ یہ باب قریب سوا دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس لئے اس عنوان کے محتویات کا تفصیلی تعارف و تبصرہ میں ممکن نہیں۔ اس ضمن میں امام غزالی کے متعلق لکھا ہے کہ

انھوں نے آکر قوم صوفیہ کے طریقہ پر کتاب احیاء اسلام تصنیف کی اور اس کو باطل حدیثوں سے بھر دیا۔ (صـ۲۳)

غرضیکہ اس کتاب میں ان راستوں کی نشان دہی کی گئی ہے جن سے ابلیس بالعموم امت میں داخل ہوتا ہے، اور ان پردوں کو چاک کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن پر تقدیس کے لیبل لگا کر شیطان لوگوں کو بہکاتا ہے لیکن (جیسا کہ شروع میں لکھا گیا ہے) مصنف اپنے فرقہ کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا، اس لئے جن عقائد و مسالک پر اس میں تنقید کی گئی ہے ان کے ماننے والے کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب فرقہ وارانہ تعصب ہے۔ اس قسم کی وہی کتاب صحیح معنوں میں مفید ہو سکتی ہے جو فرقوں کی نسبت سے بلند ہو کر خالص اسلامی نقطۂ نگاہ سے لکھی جائے۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب لکھنے والا قرآن کریم کو حق و باطل کا معیار قرار دے کر تنقید کرے۔ جو کچھ اس معیار پر پورا اترے اسے قبول کرے۔ اور جو اس کے خلاف جائے اسے مسترد قرار دے، خواہ وہ ان عقائد کے بھی خلاف کیوں نہ ہو جن پر وہ اس سے پہلے چلا آ رہا تھا۔

یہ بھی واضح رہے کہ اس کتاب میں ساری تنقید "مذہب" کی سطح پر کی گئی ہے۔ اس میں اس کا ذکر نہیں کہ "دین" میں (جو ایک اجتماعی نظام کا نام ہے) ابلیس کن کن راستوں سے داخل ہوتا ہے اور کیا کیا کرتا ہے۔

بابُ المراسلات

قدیم و جدید کی کشمکش

سوال :۔ اس وقت قریب قریب ساری دنیا میں قدیم اور جدید میں کش مکش بڑی نمایاں نظر آتی ہے۔ کیا اس سے پہلے بھی کبھی ایسا ہوا ہے؟ اس کی وجوہات کیا ہیں۔

جواب :۔ یہ قدیم اور جدید کی کش مکش نہیں "مذہب" اور "دین" کی کش مکش ہے۔ اور ہمیشہ سے چلی آرہی ہے۔ مذہب کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ اس کی طرف سے پیش کیا جائے اسے بلا تحقیق و تفتیش، اور بے چون و چرا (Unquestioningly) مان لیا جائے۔ اور جو حکم وہ دے، اس پر آنکھ بند کئے عمل کرتے چلے جائیں اور یہ کبھی نہ پوچھا جائے کہ اس کی مصلحت اور غایت کیا ہے اور مقصود و مطلوب کیا۔ اس کے برعکس دین اپنے ہر دعوے کو علم و برہان کی رو سے پیش کرتا، اور فہم و بصیرت کی رو سے ماننے کی تاکید کرتا ہے۔ وہ جہاں کوئی حکم دیتا ہے اس کے ساتھ ہی اس کی غرض و غایت اور حکمت و مصلحت بھی بیان کرتا ہے، اور اس غایت کو نتائج کی رُو سے پرکھنے کی دعوت دیتا ہے۔ حضرات انبیاء کرامؑ خدا کا دین پیش کرتے تھے لیکن ان کے بعد اس میں انسانی خیالات کی آمیزش ہو جاتی تھی۔ اور اس طرح دین مذہب کی سطح پر آ جاتا تھا۔ اس کے بعد جب دین اپنی اصلی شکل میں سامنے لایا جاتا تو مذہب پرست طبقہ کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوتی تھی؟ اور یوں مذہب اور دین کی کشمکش ابھر کر سامنے آجاتی تھی۔ نبی اکرمؐ کی جس قدر شدید مخالفت اہل کتاب کی طرف سے ہوئی وہ مذہب اور دین کی کش مکش کی بین مثال ہے۔ دین انسان کی فکری صلاحیتوں کی نشو و نما کا سامان بہم پہنچاتا ہے لیکن مذہب کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ انسان کی عقل و فکر کو مفلوج کر دیا جائے۔ اس لئے مذہب کی طرف سے ہر اُس تدبیر کی انتہائی مخالفت ہوتی ہے جس سے عقل و بصیرت کو جلا ملنے کا امکان ہو۔

یورپ کے شعور نے جب آنکھ کھولی اور اسے کائنات پر غور و فکر کرنے کا خیال پیدا ہوا، تو اس سے وہاں کے مذہب کو سخت خطرہ محسوس ہوا اور اس نے اس رجحان کو دبانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن زمانے کا تقاضا اس رجحان کے ساتھ تھا اس لئے مذہب اسے دبا نہ سکا اور وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہاں یہ کش مکش کافی عرصہ تک رہی ——— اور اگرچہ اب اس کے آثار سطح کے اوپر دکھائی نہیں دیتے، لیکن ان کے تحت الشعور میں اس کے ہلکورے ابھی تک پائے جاتے ہیں۔ چونکہ اس دور میں سامان رسل و رسائل اور اسباب مواصلات عام ہوتے گئے اس لئے مغرب کا مذکورہ صدر رجحان مقامی رہنے کے بجائے عالمگیر ہوتا چلا گیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ دنیا کے ہر حصہ میں مذہب اور اس جدید رجحان میں کش مکش شروع ہو گئی اور اب تک جاری ہے۔ چونکہ اس جدید رجحان کے حاملین کے پاس دین نہیں تھا، اس لئے ان لوگوں میں یہ کشمکش مذہب اور علم و عقل کی کش مکش تھی۔

یہی رجحان جب مسلمانوں کے ممالک میں پہنچا تو وہاں بھی وہی کش مکش شروع ہو گئی لیکن ہم میں اور دیگر اہل مذاہب میں ایک بنیادی فرق تھا۔ ان کے ہاں دین اپنی اصل شکل میں کہیں موجود نہ تھا۔ ہمارے ہاں کتاب اللہ حرفاً حرفاً محفوظ تھی اس لئے ہمارے ہاں مذہب کے مدمقابل میں دو گروہ پیدا ہوئے۔ ایک وہ جو بدقسمتی سے دین سے بے بہرہ تھا۔ وہ اس کش مکش میں اسی روش پر چل نکلا جس پر دیگر مذاہب گزیدہ ممالک کے لوگ چلے تھے۔ انہیں عام طور پر "مغرب زدہ گروہ" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ اس گروہ کی اکثریت کا یہ عالم ہے کہ وہ دین سے ناواقف ہے، اس سے متنفر اور باغی نہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ جب ان کے سامنے دین سے متعلق کوئی بات کی جائے تو وہ اس سے منہ پھیر لیتے ہیں نہ اس لئے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ انہیں پھر "مذہب" کی طرف بلایا جا رہا ہے۔ لیکن اگر ذرا ضبط و تحمل سے کام لیا جائے، تو یہ بات سننے لگ جاتے ہیں، اور رفتہ رفتہ دین کے گرویدہ ہو جاتے ہیں ——— دین کو اگر اس کی حقیقی شکل میں پیش کیا جائے تو کوئی سلیم الطبع انسان اس سے بغاوت نہیں کر سکتا۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو دین کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اور اسی کو مذہب اپنا حقیقی حریف سمجھتا ہے۔ اس لئے وہ اس گروہ کے مقابلہ میں پوری تیاریوں سے آتا ہے، اور اس کے خلاف ہر ممکن حربہ استعمال کرتا ہے۔ یہ کش مکش، مذہب اور دین کی براہ راست کش مکش ہوتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ، مذہب کی طرف سے پیش کردہ نظریات و مسالک کے خلاف اعتراض کرتا ہے۔ ان لوگوں کے پاس ان اعتراضات کا معقول اور اطمینان بخش جواب ہوتا نہیں، اس لئے یہ ان سوالات سے چڑ جاتے ہیں۔ جب دین کی طرف سے ان سوالات کا اطمینان بخش جواب مل جاتا ہے تو یہ اسے اپنی شکست سمجھتے ہیں اور اس کا غصہ دین پیش کرنے والوں کے خلاف نکالتے ہیں۔

یہ ہے وہ کش مکش جسے آپ نے "جدید اور قدیم" کی کش مکش سے تعبیر کیا ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے۔ یہ کش مکش درحقیقت

"مذہب" اور "دین" کی ہے۔ اگر اس وقت حقیقی دین کو پیش نہ کیا گیا تو ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ یا تو مغرب کی عام روش پر چل نکلے گا جس میں مذہب کو پرستش گاہوں کی چار دیواری تک محدود کر دیا جاتا اور زندگی کا نظام سیکولر انداز کا اختیار کر لیا جاتا ہے، اور یا کمیونزم کی آغوش میں چلا جائے گا جس میں مذہب کا نام تک بھی باقی نہیں رہتا۔ اس وقت دنیا میں ہر جگہ یہی ہو رہا ہے۔

واضح رہے کہ اس سے زیاں ہمارا ہی ہوگا۔ دین خداوندی کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ اس لئے کہ خدا کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر کوئی قوم دین سے روگردانی اختیار کر لیتی ہے تو خدا اس کی جگہ دوسری قوم لے آتا ہے۔ (۵/۵۴)

۲۔ قرآن کی سائنٹفک تعبیر

سوال۔ اگر قرآن کریم کی تعبیر سائنس کے انکشافات کی رُو سے کی جائے تو اس پر اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ کل کو اگر سائنس کے موجودہ نظریات غلط ثابت ہو گئے تو اس سے قرآن پر حرف آئے گا۔ اس کی وضاحت کر دیجئے۔

جواب۔ قرآن کریم کا ایک حصہ اس کے قوانین اور اصولوں پر مشتمل ہے۔ اسے وہ محکمات سے تعبیر کرتا ہے اور یہی ام الکتاب ہیں یعنی وہ انسانوں کو جو راہ نمائی دینا چاہتا ہے اس کی اصل اور جڑ یہی ہیں۔ اس حصہ کا مفہوم متعین اور مطالب واضح ہیں اس لئے اس کی تعبیرات کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے متعلق یہ دیکھا جائے گا کہ مختلف زمانوں میں ان قوانین اور اصولات پر عمل کس طرح کیا جائے گا۔ انسانی علم کی وسعت، ان کی رفعت، ہمہ گیریت اور افادیت کے دلائل بہم پہنچائیگی۔

قرآن کا دوسرا حصہ وہ ہے جس میں وہ اپنے دعاوی کی صداقت پر خارجی کائنات سے شہادات پیش کرتا ہے۔ اس کے لئے وہ کارگہ کائنات کے نظم و نسق، قوانین خداوندی کی محکمیت، تخلیق ارض و سما، تنویر شمس و قمر، تکویر لیل و نہار، غرضیکہ انفس و آفاق میں آیات اللہ پر غور و فکر کی تاکید کرتا ہے۔ اسی حصہ میں وہ امور بھی آجاتے ہیں جن کا تعلق مابعد الطبیعیات سے ہے۔ انہیں وہ تشبیہات و استعارات کے انداز میں پیش کرتا ہے۔ یہ وہ حصہ ہے جس میں مختلف زمانوں میں مختلف تعبیرات سامنے آسکتی ہیں۔ اس لئے کہ ان امور پر انسان اسی حد تک غور و فکر کر سکتا ہے جس حد تک اس کے زمانے میں انسانی علم ترقی کر چکا ہے۔ اگر ایک دور کا انسانی علم مشاہدہ یا تجربہ کسی سابقہ دور سے مختلف ہوگا تو اس دور کی تعبیرات بھی سابقہ دور سے مختلف ہوں گی۔ مثلاً قرآن کریم نے فرعون (حضرت) موسیٰ کی لاش کے متعلق کہا کہ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً (۱۰/۹۲) "پس ہم آج تیرے جسم کو (سمندر کی موجوں سے) بچالیں گے تاکہ تو ان لوگوں کے لئے جو تیرے بعد آنے والے ہیں، ایک نشان ہو"۔ اب ظاہر ہے کہ جس زمانے میں حنوطیات کے متعلق تحقیق

نہیں ہوئی تھی، اس آیت کی تعبیر کچھ اور کی جاتی تھی۔ جب اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں وہاں کے شاہی مقبروں کی کھدائی ہوئی تو ان سے بے شمار حنوط شدہ لاشیں (ممی) برآمد ہوئیں۔ انہی میں رعمیس ثانی کی لاش بھی برآمد ہوئی ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت موسیٰؑ کے زمانے کا فرعون تھا۔ اس انکشاف کے بعد قرآن کریم کی مذکورہ صدر آیت کی تعبیر بھی مختلف ہوگئی۔ اس مثال کا تعلق تاریخی انکشافات سے ہے۔ دوسری مثال فلکیات سے متعلق لیجئے۔ قرآن کریم میں اجرامِ سماوی کے متعلق ہے۔ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ (۲۱/۳۳)۔ تمام (ستارے) اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔ جب فلکیات کے متعلق قدیم تصور کارفرما تھا تو اس آیت کی تعبیر کچھ اور کی جاتی تھی۔ جب جدید انکشافات کی رو سے فلکیات کے متعلق نئی آیات (نشانیاں) سامنے آئیں تو اس آیت کی تعبیر کچھ اور ہوگئی۔ تعبیرات کے ان اختلاف سے قرآنی حقائق پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ اگر ہمارے زمانے کی کوئی علمی تحقیق سابقہ دور کی کسی تعبیر کو غلط ثابت کرتی ہے تو اس کے متعلق یہ کہا جائے گا کہ اُس زمانے کا انسانی علم ناقص تھا۔ اور اگر آج کی کوئی تعبیر بعد میں آنے والے زمانے نے غلط ثابت کر دی تو یہی بات آج کے انسانی علم کے متعلق کہی جائے گی۔ لہٰذا اس باب میں صحیح روش یہ ہے کہ ہم قرآنی حقائق کو علم انسانی کی موجودہ سطح کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں، لیکن اپنی فہم، اور اس پر مبنی تعبیر کو حرفِ آخر قرار نہ دے لیں۔ اس لئے کہ حقائق کی لامتناہیت کا تو یہ عالم ہے کہ قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَنفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا (۱۸/۱۰۹) ان سے کہدے کہ اگر میرے پروردگار کی باتیں لکھنے کے لئے دنیا کے تمام سمندر سیاہی بن جائیں تو سمندر کا پانی ختم ہو جائے گا مگر میرے پروردگار کی باتیں ختم نہیں ہوں گی۔ اگر ان سمندروں کا ساتھ دینے کے لئے ایسے ہی سمندر اور پیدا کر دیں، جب بھی وہ کفایت نہ کر سکیں"۔ حقائق کی یہی لامحدودیت ہے جس کی بنا پر ڈاکٹر جیمز آرنلڈ کرا تھر نے کہا ہے کہ "ہمیں کسی موضوع پر حرفِ آخر، آخری انسان کے لئے ہی چھوڑ دینا چاہیئے"۔

یاد رکھئے، قرآن کریم کا ایک ایک لفظ اپنی جگہ پہاڑ کی طرح اٹل ہے۔ اگر ہم اس کے حقائق کے سمجھنے میں غلطی کر جاتے ہیں تو یہ ہمارے تصور یا ہمارے زمانے کی علمی سطح کا نقص ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس خیال سے کہ ہم قرآنی حقائق کے سمجھنے میں کہیں غلطی نہ کر جائیں، ہم ان حقائق پر غور و تدبر کرنا ہی چھوڑ دیں۔ جس خدا نے غور و تدبر کا حکم دیا ہے اسے اچھی طرح سے علم تھا کہ انسانی غور و فکر غلطی بھی کر سکتا ہے اور جس دور میں غور و فکر کرنے والا انسان پیدا ہوا ہے اس دور کی علمی سطح بھی ناقص ہو سکتی ہے۔ اس کے باوجود اس نے خارجی کائنات پر غور و فکر کا بھی حکم دیا ہے اور قرآنی حقائق پر بھی۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱/۵۳) "ہم انہیں اپنی نشانیاں انفس و آفاق میں دکھائیں گے، تاکہ ان پر یہ بات ظاہر ہو جائے کہ (قرآن) واقعی ایک حقیقت ثابتہ ہے"۔ اس باب میں (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) بس اس

احتیاط کی ضرورت ہے کہ غور و فکر کرنے والا اپنی تعبیر کو حرفِ آخر نہ سمجھ لے۔

۳۔ قوانینِ فطرت اور انسانی معاشرہ

سوال۔ نظامِ فطرت میں ہر جگہ یہی نظر آتا ہے کہ بڑی مچھلی، چھوٹی مچھلی کو نگل رہی ہے۔ عقاب چڑیا کو جھپٹ کر کھا رہا ہے۔ شیر ہرن کو نوالہ بنا رہا ہے۔ جب انسان بھی فطرت ہی کا ایک جزو ہے تو اس پر یہی نظام کیوں نہیں عائد ہونے دیا جاتا؟

جواب۔ ہماری بنیادی غلطی یہ ہے کہ ہم انسان کو بھی اشیائے کائنات میں سے ایک شئے، یا اجناس حیوانات میں سے ایک جنس تصور کر لیتے ہیں۔ یہ غلطی درحقیقت نظریۂ ارتقا کے مغربی مکتشفین اور ان کے مؤیدین کی پیدا کردہ ہے جن کی نگاہ مادی نظریۂ حیات سے آگے جا ہی نہیں سکتی تھی لیکن قرآن کریم کی رو سے نہ انسان اشیائے کائنات میں سے ایک شئے ہے اور نہ ہی اجناسِ حیوانات میں سے ایک جنس (SPECIES)۔ اس کی تخلیق منفرد ہے اور یہ انفرادیت اس خصوصیت کی بنا پر ہے جسے قرآن "روحِ خداوندی" کہکر پکارتا ہے۔ یہ خصوصیت مخلوق میں کسی اور کو حاصل نہیں۔ اس سے اس کی انسانی زندگی ان قوانین کے تابع نہیں رہتی جو قوانین دیگر اشیاء یا حیوانات پر عائد ہوتے ہیں۔ فطرت کا قانون "بقائے اصلح (Survival of the fittest) ہے۔ لیکن انسانی دنیا میں قانون "بقائے انفع" ہے یعنی بقا اس کے لئے نہیں جو سب سے زیادہ طاقتور ہے بلکہ اس کیلئے ہے جو نوعِ انسانی کے لئے سب سے زیادہ نفع بخش ہے۔ وہاں "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" عام قانون ہے۔ یہاں "عدل و احسان" بنیادی ضابطہ ہے۔ انسانی راہ نمائی کے لئے وحی کی ضرورت ہی اس لئے پیش آئی تھی کہ اس کے لئے قوانینِ فطرت سے الگ اور جداگانہ ضابطۂ قوانین کی ضرورت تھی۔ اور وہ قوانین اسے فطرت کے مطالعہ سے نہیں مل سکتے تھے۔ یورپ نے انسانی معاشرہ کی تشکیل بھی قوانینِ فطرت کے مطابق کی ——— اس لئے کہ وہ اس سے ماورا کسی سرچشمۂ ہدایت کے قائل نہیں تھے ——— اور اس کا نتیجہ وہ، اور ان کے ساتھ ساری دنیا بھگت رہی ہے۔ اب وہ اپنے ناکام تجربے کے بعد، رفتہ رفتہ، اس حقیقت کو تسلیم کئے جا رہے ہیں کہ انسانی معاشرہ کی تشکیل قوانینِ فطرت کے مطابق نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ بنیادی حقوقِ انسانیت کا جو چارٹر اقوامِ متحدہ (U.N.O) نے متعین کیا ہے، وہ اس حقیقت کی کھلی ہوئی شہادت ہے۔

یاد رکھئے۔ جب تک اس بنیادی حقیقت کو تسلیم نہیں کیا جاتا کہ

(۱) انسان، ایک منفرد مخلوق ہے جس کی انسانی زندگی قوانینِ فطرت کے تابع ہے۔

(۲) اسے اپنی انسانی زندگی کی راہ نمائی کے لئے وحی کی ضرورت ہے۔ اور

(۱۱) یہ وحی اپنی منزہ شکل میں قرآن کریم کے اندر ہے۔
اس وقت تک انسان اس جہنم سے نہیں نکل سکتا جس میں وہ مغربی فکر کی بنیادی غلطی کی بنا پر گرفتار ہے۔

۴۔ اسلامی نظام کی خصوصیت

سوال ۔ اسلامی نظام معاشرہ کی وہ بنیادی خصوصیت کونسی ہے جس کے پیش کرنے سے یہ بات واضح ہو جائے کہ یہ نظام دیگر نظام ہائے زندگی سے ارفع و اعلیٰ ہے۔

جواب ۔ انسانی زندگی کا منتہیٰ ایک فرد کی انفرادیت کا استحکام اور اس کی ذات کی نشو و نما ہے۔ اختیار اور ارادہ انسانی ذات کی بنیادی خصوصیت ہے۔ اسلامی نظام فرد کے اختیار و ارادہ کی وسعتوں کو زیادہ سے زیادہ کرتا چلا جاتا ہے۔ اور اس پر صرف وہ پابندیاں عائد کرتا ہے جن سے ایک فرد دوسرے افراد کے اختیار و ارادہ کی راہ میں رکاوٹ نہ بن جائے۔ اس نظام کا مقصود و مطلوب، فرد کی انفرادیت کا حفظ و بقا ہے۔ اسی لئے وہ ہر اس ضابطہ اور اسلوب کی مخالفت کرتا ہے جس سے فرد کی انفرادیت میں کمزوری واقع ہوتی ہو۔ اس کے نزدیک ملوکیت حرام ہے کیونکہ اس اسلوب حاکمیت میں ایک فرد، دوسرے فرد کے فیصلوں کا محکوم ہو جاتا ہے۔ وہ مذہبی نظام (Theocracy) کی مخالفت کرتا ہے کیونکہ اس کے تابع فرد کو اپنی عقل و بصیرت کی رو سے کسی بات کے ماننے یا نہ ماننے کا اختیار نہیں رہتا۔ وہ نظام سرمایہ داری کا دشمن ہے کیونکہ اس میں معاشی محتاجی کی بنا پر فرد کی انفرادیت باقی نہیں رہتی۔ وہ پیدائش کے اعتبار سے انسانی بچوں میں تفریق کو باطل ٹھہراتا ہے کیونکہ اس سے ایک فرد ان حالات کی بنا پر دوسرے افراد سے پیچھے رہ جاتا ہے جن پر اسے کوئی اختیار نہیں تھا۔ اسی اصول کے مطابق وہ مرد اور عورت میں انسانی تفریق کو غلط قرار دیتا ہے کیونکہ کوئی بچہ نہ اپنی مرضی سے لڑکا بنتا ہے نہ لڑکی۔ نیز وہ ہر اس کمی کو پورا اور کمزوری کو رفع کرتا ہے جس کے پیدا کرنے کا ذمہ دار فرد متعلقہ نہیں تھا۔ یہ ہے مختصر الفاظ میں اسلامی نظام معاشرہ کی وہ خصوصیت جو اسے انسانوں کے خود ساختہ نظام ہائے زندگی سے ممتاز کرتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ اسلام کی رو سے نظام فرد کے لئے ہوتا ہے۔ فرد نظام کے لئے نہیں ہوتا۔

تیری نظروں میں ہیں تمام میرے گذشتہ روز و شب

اقبالؒ

احتساب

(۴)

عنوان بالا کے تحت ہم سابقہ اشاعتوں میں بالاختصار یہ بتاتے چلے آرہے ہیں کہ جہاں طلوعِ اسلام نے تعلیں ول دجگر کے ساتھ تحریک پاکستان کے دینی تصورات کی آبیاری کی وہاں اس خطہ زمین کے حصول کے بعد اس نے پوری جرأت و بیباکی سے ان تصورات کے تحفظ کے لئے جہادِ قلم کا فریضہ ادا کیا۔ جہاں کہیں ارباب اقتدار کے قدم نشۂ حکومت میں غلط سمت کو اٹھے اور مملکت کے بنیادی مقاصد کو کوئی خطرہ لاحق ہوا طلوعِ اسلام نے بے دریغ اعلائے کلمۃ الحق سے کام لیا اور پوری قوت سے کارفرمایانِ مملکت پر ان کی بے راہ روی واضح کی۔ اس نے صاف اور واشگاف الفاظ میں بتایا کہ اس قسم کے اقدامات کا مملکت کے مقاصدِ اعلیٰ پر کیا اثر پڑے گا اور مملکت کو ان اثرات سے محفوظ رکھنے کی کیا سبیل کیا ہے جو خدا کے دین نے اسلامی مملکت کے کارفرماؤں کے لئے تجویز فرمائی "طلوعِ اسلام" مسلسل ان حقائق کو منظرِ عام پر لاتا چلا گیا اور اسی موضوع کی چوتھی قسط آج قارئین کے سامنے ہے۔ (ادارہ)

واہ رے حُسنِ انتخاب

فروری سنہ ۱۹۵۲ء کا شمارہ ہمارے سامنے آتا ہے "حقائق و عبر" کے عنوان سے اس شمارہ میں حکومت کی بہت سی لغزشوں اور غلط کاریوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ آئینِ مملکت کی تدوین، قائدِ اعظم کے سوانحِ حیات کی ترتیب اور دیگر اہم امورِ مملکت کے لئے بعض فرنگی حضرات کی تعیناتی پر اس نے لکھا۔

ہمارے ہاں سے فرنگی چلا گیا لیکن افرنگیت کا زور پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گیا ہے حتیٰ کہ ان کاموں کے لئے بھی افرنگیوں کا انتخاب عمل میں آتا ہے جن کے متعلق خود افرنگی کے تصور میں بھی نہ آیا ہوگا کہ انھیں ان کاموں کے لئے بھی چنا جا سکتا ہے۔ مثلاً دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے دستور کی تسوید کے لئے ایک خالص افرنگی ڈرافٹسمین، مجلس دستور ساز کے سیکریٹریٹ میں مصروف خامہ فرسائی ہیں۔ ان کے بعد ایک اور صاحب بہادر کا انتخاب عمل میں آیا ہے جو ہمیں یہ بتائیں گے کہ ہمارے قائداعظم (مرحوم و مغفور) کیسے تھے۔ غور فرمایئے! قائداعظم ہمارے اور ان کی سیرت نگاری کا کام ایک ایسے صاحب (MR. BOLITHO) کے سپرد کیا گیا ہے جسے عمر بھر ان سے ملنے تک کا شرف بھی حاصل نہیں ہوا۔ وہ خیر سے پاکستان میں تشریف فرما ہیں اور ہر "راہ رو" سے کہہ رہے ہیں کہ ذرا قائداعظم کی کوئی بات تو سناتے جاؤ کہتے ہیں کہ ان کی "محنت شاقہ" پر کوئی پچاس ہزار روپیہ صرف ہوگا۔ اس کے بعد وہ قائداعظم کے سوانح حیات قلم بند فرمائیں گے اور کتاب ان کی اپنی ملکیت ہوگی۔

(شمارہ فروری ۱۹۵۲ء۔ صفحہ ۲۸)

آزادی کی نعمتیں! اسی عنوان سے دوسری چیز حکومت پاکستان کی اس مضحکہ خیز ترمیم سے متعلق تھی جو اس نے پاکستان میں نافذ پذیر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ (۱۹۳۵ء) میں کی۔ اس سلسلے میں طلوع اسلام نے لکھا۔

.... اس میں شبہ نہیں کہ پاکستان میں ہنوز گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء ہی رائج ہے لیکن حکومت پاکستان نے اس میں ایسی ایسی اہم تبدیلیاں کر لی ہیں کہ ان سے "غلامی" کی بہت سی شقیں "آزادی" میں بدل گئی ہیں۔ مثلاً گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی شق ۳۶ میں لکھا ہے کہ کوئی شخص مجلس مقننہ کا ممبر نہیں بن سکتا اگر

(ا) وہ فاتر العقل ہو (اا) دیوالیہ ہو۔ (اا) دو سال یا اس سے زیادہ کی قید کا سزایاب ہو (اا) انتخابات کے سلسلے میں کسی ناجائز یا خلاف قانون کارروائی کا مرتکب ہوا ہو۔

اب اس ایکٹ کو اٹھا کر دیکھئے جسے حکومت پاکستان نے اپنے ہاں رائج کر رکھا ہے۔ اس میں شق ۳۶ کے سامنے لکھا ہے ——— "حذف کر دی گئی" (OMITTED)۔ غور کیجئے! کس قدر اہم تبدیلی ہے؟ اب ہر فاتر العقل، ہر دیوالیہ، ہر سزایاب یا الیکشن میں "چار سو بیس"

کا مرتکب دھڑلے سے ممبر بن سکتا ہے۔ اگر یہ آزادی نہیں تو اور کسے آزادی کہتے ہیں؟ آزادی نام ہے پابندیاں ہٹا دینے کا۔ انگریزوں نے محکوم قوم پر خواہ مخواہ پابندیاں عائد کر رکھی تھیں کہ کوئی پاگل، کوئی دیوالیہ، کوئی مجرم، مجلس مقننہ کا ممبر منتخب نہیں ہو سکتا۔ اللہ نے ہمیں آزادی کی نعمت سے نوازا تو ہم نے ان پابندیوں کو بیک جنبش قلم اٹھا دیا۔ سبحان اللہ! آزادی بھی دنیا میں کتنی بڑی نعمت ہے!! اگر ہمیں آزادی نہ ملتی تو پاگلوں کو مجلس مقننہ کے بجائے، پاگل خانوں میں بھیجنا پڑتا۔ دیوالیوں اور مجرموں کے لئے قید خانے بنوانے پڑتے۔ اب یہ مسئلہ کیسا آسان ہو گیا؟

ہم بعض دفعہ سوچتے ہیں کہ اگر انگریز کا قانون علیٰ حالہٖ رہتا اور ہمیں اس میں تبدیلی کی آزادی نہ ملتی تو ہماری مجلس دستور ساز کی کتنی ہی نشستیں خالی ہو جاتیں! کیا اب بھی تم خدا کی نعمتوں کا شکریہ ادا نہ کرو گے؟ (شمارہ فروری ۱۹۵۲ء۔ صفحہ ۹۹)

نظریۂ اضافیت کے پیکرِ مشہود

ایک صاحب نے آئن سٹائن کا نظریۂ اضافیت (THEORY OF RELATIVITY) سمجھنے کے لئے طلوعِ اسلام کو خط لکھا۔ حقائق و عبر کے انہی کالموں میں اس کا جواب دیا گیا۔ جواب کس قدر لطیف، دلچسپ اور اس کے ساتھ ہی عبرت آموز تھا۔ اور قومی غیرت کے لئے کتنا گہرا طنز چھپا تھا اس کے بین السطور میں۔ سنیئے!

اب نظریۂ اضافیت کو سمجھنے کے لئے کتابیں پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ کراچی تشریف لے آئیے۔ چار دن میں بات سمجھ میں آ جائے گی۔ ایک شخص عمر آپ میں رہتا ہے۔ کسی کو اس کی کوئی خوبی دکھائی نہیں دیتی۔ اسے وزیر یا سفیر بنا دیا جاتا ہے۔ دوسرے ہی دن دنیا بھر کی تمام خوبیاں اس میں جمع ہو جاتی ہیں۔ چاروں طرف سے اس کی حمد و ستائش کے غلغلے بلند ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ اس کے تدبر و سیاست، فہم و فراست، علم و عقل، جہاں بانی و جہاں بینی کے چرچے ساری فضا کو مرتعش کر دیتے ہیں۔ ہر طرف سے آوازیں آنی شروع ہو جاتی ہیں کہ

آفتاب تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا

میاں تو ایک طرف، بیگم صاحبہ بھی مسائل سلطنت کی عقدہ کشائی میں نورجہاں، مہمات امور کے سر کرنے میں چاند بی بی اور فصاحت و طلاقت میں قرۃ العین سے کم دکھائی نہیں

دیتیں۔ یہاں کسی انجمن کا افتتاح ہو رہا ہے۔ وہاں خطبہ صدارت ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہیں کسی نئے کلب کی بنیاد رکھی جا رہی ہے۔ اخبارات کی پیشانیاں ان کی تصاویر سے مزین کی جاتی ہیں۔۔ کہ اتنے میں میاں صاحب قلمدانِ وزارت یا کرسیٔ سفارت سے الگ ہو جاتے (یا کر دیئے جاتے) ہیں۔ اور دوسرے ہی دن ان دونوں کی خوبیاں غائب غلّہ ہو جاتی ہیں۔

اسے کہتے ہیں "اضافیت" یعنی جہاں ہر خوبی اور قابلیت اضافی ہو، ذاتی نہ ہو۔ مسندِ حکومت پر آ بیٹھے تو اس کی نسبت سے ساری خوبیاں جمع ہو گئیں جہاں یہ نسبت الگ ہوئی، پھر نکام صاحب ننگے کے ننگے۔ (شمارہ فروری ۱۹۵۲ء ۔ صفہ)

مفتیانِ کرام کا فتویٰ

مارچ ۱۹۵۴ء کے "حقائق و عبر" ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان میں "اب حرام ہے" کے ذیلی عنوان سے ایک اہم مسئلہ سامنے آتا ہے۔ دارالسلطنت (کراچی) میں ایک اہم استفتاء اور مفتیان شرع مبین کا جواب ایک پوسٹر کی صورت میں بڑی دھوم دھام سے شائع ہوا اور کراچی کے گلی کوچوں میں چسپاں کیا گیا تھا کہ کیا لاٹری سے حاصل کیا ہوا روپیہ شرعاً جائز ہے؟ اور کیا اسے فقراء یا مہاجرین کی آبادکاری جیسے معاملات میں بروئے استعمال لایا جا سکتا ہے اور جواباً مفتی محمد شفیع، مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا عبدالحامد بدایونی اور سید سلیمان ندوی صاحبان نے متفقہ طور پر فتویٰ دیا تھا کہ لاٹری حرام ہے اور اس کے روپے کا استعمال گناہِ عظیم۔ یہاں تک بات درست تھی اور اس میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہ تھی لیکن اس تصویر کا ایک دوسرا پہلو بھی تھا اور بڑا قابلِ غور تھا یہ پہلو۔ طلوعِ اسلام نے مذکورہ تفصیل پیش کرنے کے بعد اس دوسرے پہلو کو ایک تازیانۂ عبرت کے طور پر یوں پیش کیا۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد متعدد نمائشیں لگیں۔ بہت سے مینا بازار منعقد ہوئے۔ ان کے لئے انعامی ٹکٹ بکے۔ لاٹریاں نکالی گئیں۔ لاٹریوں میں انعام بٹے۔ لاٹریاں قوم کی بڑی بڑی برگزیدہ ہستیوں نے نکالیں۔ انعامات معزز خواتین و بیگمات کے ہاتھوں تقسیم ہوئے۔ یہ سب کچھ دارالخلافت کراچی میں بجلی کی جگمگاتی روشنی میں ہوتا رہا۔ حضرات علمائے کرام آج بھی کراچی میں موجود تھے۔ کسی کو جرأت نہیں ہوئی کہ ان خرافات کے خلاف ایک حرف بھی زبان پر لائے۔ لیکن اب حالات میں کیا اہم تبدیلی پیدا ہو گئی جو اسی قسم کی لاٹری کے اعلان پر حضرات علمائے کرام کی رگِ شریعت پھڑ پھڑا اٹھی۔ اور جھٹ سے فتویٰ سرِبام آ گیا۔ ہم گنہگاروں کے نزدیک تو لاٹری (اور قرعہ اندازی) جیسی اب ناجائز ہے ویسی پہلے بھی تھی لیکن کیا

کوئی ان مفتیانِ شرعِ مبین اور حاملانِ دینِ متین سے اتنا پوچھنے کی گستاخی کر سکتا ہے کہ داڑھی پہلی نمائشوں میں حرام کیوں نہ تھی؟ اور اب کیوں حرام ہو گئی؟ معلوم ہوتا ہے کہ بچے کے ختنے کی طرح ان حضرات کا فتویٰ بھی یہ نیا سمجھدار واقع ہوا ہے۔ وقت بے وقت میں تمیز کر لیتا ہے۔

(شمارہ مارچ ۱۹۵۵ء - صفحہ ۲۶)

حصولِ پاکستان کی فتحِ عظیم کے بعد ہونا یہ چاہیئے تھا کہ افرادِ ملت میں ایک خوش آئند نفسیاتی انقلاب رونما ہوتا۔ ان کے دلوں میں زندگی کے نئے عزائم اور ولولے برپا ہو جاتے لیکن، اس کے برخلاف ہوا یہ کہ چاروں طرف مایوسیوں اور پریشانیوں کا ہجوم ابھرنے لگا۔ طلوعِ اسلام جس کا ہاتھ قوم کی نبض پر تھا اور نگاہ حقائقِ قرآنی پر، اس صورتِ حال سے صرفِ نظر نہ کر سکا۔ چنانچہ اپریل ۱۹۵۱ء کے لمعات (افتتاحیہ) میں اس نے قرآنی فکر کی روشنی میں قومی نفسیات کا بھرپور جائزہ لیا اور بتایا کہ ساری کیفیت محض اس بنا پر رونما ہوئی ہے کہ جذباتی نعروں کے طوفان میں عوام کو حصولِ پاکستان کے "متعین مقصد" سے بے نصیب کر دیا گیا ہے اور وہ یہ تک نہیں جانتے کہ یہاں جس اسلامی نظام کے قیام کے نعرے چاروں طرف گونج رہے ہیں اس سے متعین طور پر مراد کیا ہے؟ اس سلسلے میں اس نے برسرِ اقتدار طبقے کے مقام و منصب کو بھی بے نقاب کرنا ضروری سمجھا اور لکھا۔

اس تحریک (حصولِ پاکستان) میں جو لوگ نمایاں طور پر آگے بڑھے ان کا ایک خاص پس منظر ہے۔ نمایاں طور پر، اس لئے کہ یوں تو پوری قوم مطالبۂ پاکستان میں ہمنوا تھی لیکن جس طبقے کا ذکر آگے آ رہا ہے وہ نمایاں طور پر سامنے آ گیا تھا) انگریزوں نے اپنی عملداری میں ایک خاص طبقہ یہاں پیدا کیا تھا جو جاگیرداروں، زمینداروں، سرمایہ داروں، رئیس اعظموں، خان بہادروں پر مشتمل تھا۔ ان لوگوں کو سفید پوش، کرسی نشین، درباری کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ یہ واسطہ بنتے تھے رعایا اور حکومت کے درمیان۔ اس جہت سے ان کی بڑی عزت تھی اور یہی قوم کے نمائندے سمجھے جاتے تھے۔

جب یہاں تحریکِ آزادی (یعنی تحریکِ سوراج) چلی تو اس نے عزتوں کا معیار بدل دیا۔ اب وہی طبقہ جس کا ذکر کیا گیا ہے "ٹوڈی" کہلانے اور قوم کی نگاہ میں ذلیل شمار ہونے لگا۔ حالت یہ ہو گئی کہ وہ لوگ جو اس سے پہلے باہر نکلتے تھے تو عوام تعظیم کے لئے راستوں سے ایک طرف ہٹ جایا کرتے تھے، اب منہ چھپا کر گھروں سے باہر نکلتے تھے۔ سوسائٹی میں

ان کا کوئی مقام باقی نہ تھا۔ (شمارہ اپریل ۱۹۵۱ء۔ ص۷)

اور جب تحریکِ پاکستان کا دور شروع ہوا تو پھر اس طبقے نے ایک نئی کروٹ بدلی اور طلوعِ اسلام کے الفاظ میں

> اس طبقہ نے جو اس وقت کونوں کھدروں میں چھپ کر بیٹھ چکا تھا، اس موقعہ کو غنیمت جانا ..... چنانچہ وہ لوگ ان مصالح کی بنا پر اپنی چھنی ہوئی عزت اور لٹے ہوئے وقار کی بازیابی کے لئے گوشوں اور زاویوں سے نکل باہر کھڑے ہوئے۔ پاکستان کا مقدمہ لڑنے کے لئے قائدِ اعظم کی دیانت اور وکیلانہ فراست کافی تھی۔ ان لوگوں کا کام صرف اس قدر تھا کہ عدالت میں کہہ دیں کہ جناح ہمارا وکیل ہے اور ہم نے اسے مختار نامہ دے رکھا ہے۔
>
> یہ تھے بالعموم وہ لوگ جو تحریکِ پاکستان کے نمائندے بن گئے اور یہی لوگ آگے چل کر قوم کی تقدیروں کے مالک ہو گئے۔ (ایضاً۔ ص۸)

خودکشی کی واردات کیوں؟

ایک طرف مایوسیوں اور پریشانیوں کا دور دورہ تھا اور دوسری طرف خودکشی کی وارداتیں اس قدر عام ہو رہی تھیں کہ ہر قلب حساس اس سے ظلم و پیچ و تاب بن رہا تھا۔ طلوعِ اسلام نے جون ۱۹۵۱ء کے "لمعات" میں ان ہولناک حادثوں کا بتفصیل تجزیہ کیا اور ان کے محرکات منظرِ عام پر لانے کے بعد لکھا۔

> خودکشی کے یہ کثیر التعداد واقعات، درحقیقت، اس جنون اور دیوانگی کے آثار ہیں جو اس وقت قوم کے دماغوں پر مسلط ہوتی جا رہی ہے۔ اس کا سبب دریافت کرنے کے لئے کسی تحقیقاتی کمیٹی کے تعین کی ضرورت نہیں۔ بات بالکل کھلی ہوئی اور واضح ہے تقسیمِ ہند کے ساتھ مسلمانوں پر جو قیامت گزری تھی وہ کسی قوم کا دماغی توازن کھو دینے کے لئے کم نہ تھی لیکن اس ہولناک مرحلے سے قوم آگے نکل آئی۔ اس امید کے سہارے کہ پاکستان ان کے خوابوں کی تعبیر، ان کی آرزوؤں کا گہوارہ، ان کی امیدوں کا سہارا، ان کے مستقبل کی خوش حالیوں کا ضامن اور ان کی زندگی کی خوشگواریوں کا کفیل نظر آتا تھا، قوم اس صبحِ درخشاں کی امید کے سہارے، شبِ تیرہ و تار کی بھیانک ظلمتوں سے آگے نکل آئی لیکن یہاں کی پانچ سالہ زندگی نے ان کی تمام امیدوں کو ایک ایک کر کے توڑ ڈالا۔ انھوں نے اپنے ذہنوں میں جو نقشے قائم کر رکھے تھے وہ ایک ایک کر کے غلط ثابت ہو گئے۔ انھوں نے یہ تو دیکھ

لیا کہ وہ رات کی تاریکیوں کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ افق پاکستان سے جو صبح نمودار ہوئی ہے وہ کسی امید کی کرن کو اپنے ساتھ نہیں لائی۔ انھوں نے اس صبح کو دیکھا اور بصد حسرت و یاس پکار اٹھے کہ

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں

تقسیم ہند کی بے پناہ مصیبتوں نے بدن سے قوت مدافعت سلب کر لی تھی۔ اس پنجالہ یاس و نا امیدی نے ان کے اعصاب کے ایک ایک تار کو توڑ ڈالا۔ جن کے اعصاب میں کچھ سکت باقی ہے وہ اپنے لئے موہوم امیدیں پیدا کر کے زندگی کے دن پورے کر لیتے ہیں، جن میں اتنی سی سکت بھی باقی نہیں رہتی وہ اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا کاٹ لیتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جن کے دماغی توازن کا بگاڑ ابھر کر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ ورنہ اس وقت حقیقت یہ ہو چکی ہے کہ قوم کا بیشتر حصہ اپنا دماغی توازن کھو چکا ہے۔ کسی میں بات سننے کی تاب نہیں رہی۔ کسی میں برداشت کی قوت نہیں۔ اور غور و فکر کی صلاحیت تو قریب قریب معدوم ہو چکی ہے۔ (شمارہ جون ۱۹۵۲ء۔ صـ۵)

مجرم کون ہے؟ یہ کچھ وضاحت کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے بتایا کہ اس جگر پاش صورتِ حال کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے ——— یہی درحقیقت خودکشی کی واردات کا مجرم کون ہے۔ سنیئے!

سوچیئے کہ کہیں حقیقت یہ تو نہیں کہ اس جرم کا نام ہم نے "خودکشی" اس لئے رکھ چھوڑا ہے کہ اگر خود فریبی یا فریب دہی کا پردہ اٹھ جائے تو خودکشی کرنے والے کے اصل قاتل ہم ہی قرار پائیں؟ یعنی کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم نے جرم قتل کی سزا سے بچنے کے لئے اس کا نام خودکشی رکھ چھوڑا ہے تاکہ کسی کی نظر ہم پر نہ پڑے۔

انسانوں کے خود ساختہ قوانین اور ان کو نافذ کرنے والی عدالتیں ان سوالات کا جواب کچھ ہی کیوں نہ دیں، کائنات کا وہ عالمگیر قانون جو آفاقی اور انسانی دونوں دنیاؤں کو محیط ہے اس قسم کے حادثات کا مجرم اس معاشرہ کو قرار دیتا ہے جس میں خودکشی کرنے والا اپنے لئے زندگی اور اس کی خوشگواریوں کا کوئی سامان نہیں پاتا۔ خودکشی صرف انسانی معاشرے میں ہی ممکن ہے۔ کوئی حیوان خودکشی نہیں کرتا۔ وہ خودکشی کر ہی نہیں سکتا۔ یہ خصوصیت

صرف انسانی تمدن کی ہے ....

لہذا خودکشی پیدا کردہ ہے اس معاشرہ کی جس میں فرد کو تنہا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اور تنہا اس لئے چھوڑ دیا جاتا ہے کہ معاشرہ سمجھتا ہے کہ میرا کام اس کے بغیر بھی چل سکتا ہے یعنی اس معاشرہ میں فرد معاشرہ کے قیام کے لئے زندہ ہوتا ہے۔ معاشرہ فرد کی حفاظت کے لئے قائم نہیں ہوتا۔ یہ وہ معاشرہ جو انسانوں کے خودساختہ قوانین پر مبنی ہوتا ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۳۲)

اس وضاحت کے بعد طلوعِ اسلام قرآنی معاشرہ کی تفصیلات علیٰ وجہ البصیرت پیش کرتا ہے اور اس اہم مقالہ کا اختتام حسب ذیل حقیقت پر ہوتا ہے۔

مسلمان بھی اس وقت فکر و نظر کی پریشانی کا شکار ہے۔ اس کے سنبھالنے کا کام یہ ہے کہ اس میں ایک آواز پر جمع ہو جانے کی عادت ڈال دی جائے۔ یہ آواز کسی انسان کی آواز نہیں ہو سکتی یہ آواز خود اللہ کی آواز ہے جو قرآن کے ریکارڈ میں محفوظ ہے۔ مسلمانوں کی اسی آواز پر لبیک کہنے کی عادت پڑ جائے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔ طلوعِ اسلام کا مشن صرف اتنا ہے کہ یہ مسلمانوں کے سامنے اس رازِ حیات کو بے نقاب کر دے کہ استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم (۸/۲۴) اس قرآنی نظام کے مرکز کی آواز پر لبیک کہو جو تمہیں اس چیز کی دعوت دیتا ہے جو زندگی عطا کرنے والی ہے۔ یاد رکھئے! استجابت (RESPONSE) ہی زندگی کی نشانی ہے۔ زندہ وہ ہے جو کسی کی آواز کا جواب دیتا ہے۔ خدا چونکہ مستقل حیات ہے۔ اس لئے وہ ہر بلانے والے کی آواز کا جواب دیتا ہے۔ اجیب دعوۃ الداع اذا دعان میں ہر پکارنے والے کی آواز کا جواب دیتا ہوں۔ اس لئے اس کا مطالبہ بھی یہ ہے کہ فلیستجیبوا لی (۲/۱۸۶) تم میری آواز پر لبیک کہو۔ میرے بلاوے کا جواب دو۔ خدا کی آواز اس کا بلاوا قرآن ہے جس دن مسلمان نے قرآن کی آواز کا جواب دینا شروع کر دیا اسی دن زندگی کی تمام حرارتیں اس کے جسم میں گردش کرنے لگ جائیں گی .....

جب یہ ہو گیا تو پھر دیکھئے گا کہ وہ معاشرہ کتنی جلدی وجود میں آتا ہے جس میں زندگی اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ زمزمہ بار و نغمہ خیز ہو گی۔ اور کوئی فرد اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کرے گا اس لئے خودکشی کا لفظ اس کی لغت میں باقی نہ رہے گا۔ آپ نے آج تک کہیں سنا کہ عہدِ رسالتمآب میں کسی شخص نے خودکشی کی ہو؟ وہ معاشرہ تو دنیا کو زندگی بانٹنے کے لئے قائم ہوا تھا اس میں خودکشی کا کیا کام! (ایضاً۔ صفحہ ۴۳)

اگست ۱۹۵۲ء کا آغاز ہوتا ہے۔ مملکتِ پاکستان اپنی زندگی کے پانچ سال پورے کر رہی ہے۔ اسی ماہ کے شمارے میں طلوعِ اسلام اپنے افتتاحیہ میں اس پانچ سالہ عہدِ ماضی کا بھرپور جائزہ لیتا ہے۔ اس کے سامنے قومی زندگی کے مختلف طبقے آتے ہیں اور اس ضمن میں طبقۂ اول کے طور پر وہ عوام آتے ہیں۔ جو قوموں کی حیات و ممات میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ ہماری نئی نویلی مملکت میں ان عوام کا کیا حشر ہوا اور ان کی اہمیت کس بے نیازی سے پس پشت ڈال دی گئی طلوعِ اسلام نے اس داستانِ غم کو پیش کرتے ہوئے لکھا۔

ہمارے مطالبۂ پاکستان کی خشتِ اول یہی عوام تھے . . . یہی عوام ہیں جو خون کے دریا تیرتے اور آگ کے شعلوں سے کھیلتے، نگاہوں میں ایک نئی دنیا کا منظر اور دلوں میں ایک جہانِ نو کا تصور لئے، اپنا سب کچھ برباد کر کے یہاں پہنچے تاکہ پاکستان آباد ہو جائے۔ انھوں نے یہاں پہنچ کر کچھ نہیں مانگا کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ شہروں میں آئے تو بڑے بڑے سربفلک محلات کے زیرِ سایہ دیوار رہ گزاروں (FOOT PATHS) کے کنارے بجری کے فرش اور اینٹ کے تکیئے پر، اور اگر دیہات کا رُخ کیا تو سڑک کے کنارے، درختوں کے سائے میں یوں اطمینان سے سو گئے گویا ہفت اقلیم کی بادشاہت ان کے حصہ میں آگئی، ان کے نزدیک تشکیلِ پاکستان فی الواقع ہفت اقلیم کی بادشاہت تھی۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ جب ان کی آنکھ کھلتی تو وہ دیکھتے کہ یہاں ساری دنیا لوٹ میں مصروف ہے لیکن یہ ان کی طرف کبھی للچائی ہوئی نظروں سے نہ دیکھتے۔ ان کے تصورات کی رُو سے پاکستان نام تھا دیانت، امانت، اور عدل و انصاف کے سائے میں خوشحالیوں اور خوشگواریوں کی ضمانت کا، دن گزرتے گئے اور ان کی امیدوں کی ہر نورانی صبح، یاس انگیز شام کی تاریکیوں میں گم ہوتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ ان "مفرداد" محلات کے مکینوں کی نگاہوں میں ان کا فٹ پاتھ پر سونا بھی کھٹکنے لگا۔ انھیں اندیشہ لاحق ہو گیا کہ اگر ان خاک نشینوں کو کسی دن فٹ پاتھ کی پستی اور محلات کی بلندی کا تفاوت سچ مچ نظر آنے لگ گیا تو مبادا ان کے دلوں میں نیچے سے اُٹھ کر اوپر جانے کا ولولہ پیدا ہو جائے۔ اس کے لئے انھوں نے ایسا انتظام کیا جس سے وقتاً فوقتاً خطرے کی گھنٹی کھٹکا دی جاتی ہے کہ ان لوگوں کو فٹ پاتھ سے اٹھا دیا جائے گا کیونکہ اس سے صحتِ عامہ خطرے میں ہے۔ اس آواز کے سنتے ہی ان بیچاروں کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ اور یہ بے ساختہ پکارنے لگ جاتے ہیں کہ

ہمیں فٹ پاتھ سے نہ اٹھائیے

چنانچہ "حسنِ تدبیر" کی فسوں کاریوں سے ان عوام کو اس مقام تک پہنچا دیا گیا ہے جہاں ان کی زندگی کے تمام مقاصد اور مستقبل کے تمام تصورات، اپنی خوش حالیوں اور خوش گواریوں کے تمام ممکن مطالبات سے سمٹ سمٹا کر اس التجا میں مرکوز ہو گئے ہیں کہ "ہمیں فٹ پاتھ سے نہ اٹھائیے۔" اب وہ اس سے زیادہ سوچنے کے قابل ہی نہیں رہے۔ (شمارہ اگست ۱۹۶۲ء، صفحہ ۲)

پھر معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا آگے بڑھتا ہے۔ طلوعِ اسلام کی زبان سے سنئے !

یہ ہے وہ مقام جہاں ہمارے عوام کی اکثریت پہنچ چکی ہے۔ طبقۂ اعلیٰ ان کی طرف نہایت حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ اور بات بات پر ان کے عیوب گنانے شروع کر دیتا ہے۔۔ یہ جاہل ہیں۔ غلیظ ہیں۔ بدتمیز ہیں۔ بے ایمان ہیں۔ کام چور ہیں۔ سہل انگار ہیں ——— اور آگے بڑھیئے تو —— جرائم پیشہ ہیں۔ بے غیرت ہیں۔ دیوث ہیں۔ پست اخلاق ہیں۔ کمینہ فطرت ہیں۔ اور نہ جانے کیا کیا ہیں۔ یہ سب سچ ہے لیکن ان "ناصحین شفق" سے کون پوچھے کہ ان کے ان عیوب کا مقام کا ذمہ دار کون ہے؟ انہیں اس حالت تک پہنچا کس نے دیا۔

شکر یہ پرسشِ غم کا، مگر اصرار نہ کر

پوچھنے والے یہ تیرا ہی کہیں راز نہ ہو (ایضاً ص۳)

اس کے بعد دوسرے طبقے کا ذکر یوں شروع ہوتا ہے :۔

دوسرا طبقہ وہ ہے جس کے نزدیک پاکستان سے مفہوم، دولت سمیٹنا اور جاہ و مناصب کی کرسیاں سنبھالنا ہے۔ ان میں سے کچھ کامیاب ہیں باقی ہنوز ناکام۔ جو کامیاب ہیں وہ اپنی "فتوحات" کی حفاظت کی فکر میں غلطاں و پیچاں ہیں۔ جو ناکام ہیں وہ اول الذکر سے ان "فتوحات" کے چھیننے اور جھپٹنے کی ہوس میں آشفتہ و پریشان۔ جو ان "فتوحات" کو سنبھالے بیٹھے ہیں وہ اس متاعِ گراں بہا (دولتِ خداداد) کے تحفظ (یعنی انہیں اپنے تک محدود رکھنے) میں اسلام کی حفاظت اور اس کی تقویت میں پاکستان کی تقویت قرار دیتے ہیں۔ جو لوگ ان فتوحات کو ان سے چھیننا چاہتے ہیں ان کا دعویٰ یہ ہے کہ اگر یہ چیزیں دوسری پارٹی کے پاس رہیں تو اس سے اسلام سخت خطرے میں اور پاکستان موت کی آغوش میں چلا جائے گا۔ برعکس اس کے، اگر یہ مال و منال اور جاہ و اقتدار ان کے ہاتھ میں آجائے تو پھر اسلام محفوظ ہو جائے گا اور پاکستان مضبوط۔ ان میں جو کامیاب ہیں ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم قائداعظم کے ترکہ کے جائز وارث اور

مسلم لیگ کی "قبر" کے متولی ہیں، اس لئے اس آستانۂ عالیہ کی سجادہ نشینی ہمارا حق اور "خلافت" ہمارا ورثہ ہے۔ (ایضاً۔ صث)

پھر ایک اور گروہ سامنے آتا ہے جو مذہب کا نقاب اوڑھ کر اپنے ذاتی مقاصد و منافع کے حصول کے لئے کوشاں ہے۔ اس گروہ کے تاسف انگیز عزائم کی نقاب کشائی کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے لکھا۔

"تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ جب زمامِ اختیار ان لوگوں کے ہاتھ میں آجائے جو خدا کے نام (مذہب) کو اپنی ہوسِ اقتدار کا آلۂ کار بنائیں تو یہ دورِ تاریخِ انسانیت میں سب سے زیادہ وحشت انگیز اور انسانیت کش ہوتے ہیں۔ اس وقت ہر گرگ خون آشام، برۂ معصوم کی کھال اوڑھ کر سامنے آتا ہے۔ اور ہر ابلیس، خدائی فوجدار ہونے کا مدعی ہوتا ہے۔ جبر و قہرمانیت کے اس اندازِ سیاست میں، جسے مذہبی پیشواؤں (PRIESTS) کا گروہ "حکومتِ الٰہیہ" (THEOCRACY) کے مقدس نام سے لوگوں پر مسلط کرتا ہے، خدا کے نام پر، ہر وہ ظلم و استبداد روا رکھا جاتا ہے جس سے خود ظلم شرمائے اور استبداد کی آنکھوں میں حیا آجائے۔ اہلِ پاکستان کی بدبختی ہے، آج ان "فتوحات" چھیننے والے ہوس کاروں میں ایک گروہ وہ ہے جو اپنے حصولِ مقصد کے لئے مذہب کو آلۂ کار بنا رہا ہے۔ (ایضاً۔ صا)

ان تمام طائفوں کی حقیقت کو واشگاف طور پر پیش کرنے کے بعد طلوعِ اسلام ان مخلصین کو مخاطب کرتا ہے جنھوں نے تمام مفادات سے بالاتر ہو کر تحریکِ پاکستان کے لئے اپنی ہر متاعِ عزیز کی بازی لگائی تھی اور اب صورتِ حال سے مایوس ہو کر گوشہ نشینی میں بسر اوقات کر رہا تھا۔ یہی لوگ تحریکِ پاکستان کے بلند و بالا مقاصد کی بجا آوری کے لئے ملت کا بیش بہا سرمایہ ثابت ہو سکتے تھے۔ طلوعِ اسلام ان کے تعارف میں لکھتا ہے۔

یہی گروہ "درحقیقت" ہمارا مخاطب ہے اور انہی سے ہماری توقعات وابستہ ہیں۔ یہ وہ گروہ ہے جس نے تحریکِ پاکستان میں پورے انہماک سے حصہ لیا۔ اس گروہ کے سامنے حصولِ پاکستان سے کوئی ذاتی مفاد نہیں تھا۔ ان کا مقصد صرف اس قدر تھا کہ اس خطۂ زمین میں خدا کے اس نظامِ عدل و ربوبیت کو عملاً نافذ کیا جا سکے جو انسانیت کی نشو و نما کا ضامن اور جوہرِ خودی کی برومندی اور ثمرباری کا کفیل ہے۔ یہ گروہ ان حسین توقعات کو لے کر پاکستان میں آیا تھا لیکن اس پانچ سال کے عرصے میں انھوں نے جو کچھ دیکھا اس سے یہ سخت شکستہ خاطر ہو گئے۔ اور اب ان کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ مستقبل سے ناامید، عملی رہبانیت اختیار کر چکے ہیں۔ (ایضاً۔ ص۱۶)

اور پھر اس تعارف کے بعد وہ ملت کے ان صاحبِ خلوص اور ایثار پیشہ مجاہدوں کو یوں پیامِ بیداری اور دعوتِ پیکار دیتا ہے۔

> اگر آپ بھی ناسازگاریٔ حالات سے مایوس ہو کر رسمِ خانقاہیت اختیار کر لیں اور دنیا کے ہنگاموں سے منہ موڑ کر گوشوں اور زاویوں میں روٹھ کر بیٹھ جائیں تو اس نظامِ ربوبیت کی تنفیذ کے لئے آسمان سے فرشتے آئیں گے؟ اگر وہ سر جن میں ربوبیتِ انسانیہ کو بے حجاب جلوہ فرما دیکھنے کا سودا ہے، اس طرح بازورش ہو جائیں تو کہیے کہ باطل کے انسانیت سوز کارگہ شیشہ گراں میں کلوخ اندازی کا جنون اپنا مسکن کہاں تلاش کرے؟ اگر وہ دل، جن میں ارضی معاشرہ کو سماوی قوانین سے ہم آہنگ کرنے کا ولولہ موج انگیز تھا، فرطِ یاس سے لحد سینہ میں ہم آغوشِ موت ہو جائے تو فرمائیے کہ مفاد پرستانہ ہیرہ بازیوں کی بساط الٹنے کا جذبہ کونسے قلب کو اپنا مامن بنائے؟ سوچیے اور جواب دیجیے! اس کا جواب آپ کے ذمے ہے۔ اگر اس مقام تک پہنچ کر یوں روٹھ جانا تھا تو
>
> مکتبِ عشق میں کیا کام تھا، آیا کیوں تھا؟　　(ایضاً، صـ۹ـ)

یہ کہتے ہوئے وہ ان کے سینوں میں امیدوں کے نئے چراغ روشن کرتا ہے اور پکارتا ہے کہ

> دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
> کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

> حالات کی ناسازگاری، مخالفتوں کے ہجوم اور اپنی بے سروسامانی سے نہ گھبرائیے۔ اس لئے کہ شعلۂ عشق کی یہ چھوٹی سی چنگاری، جو آپ کے سینے میں زندہ و تابندہ ہے، ہزار سامانوں پر بھی بھاری ہے کیونکہ یہ اپنی زندگی اور تابندگی کے لئے کسی خارجی قوت کی محتاج نہیں۔ اس کی زندگی خود اس کے سوز و دروں سے قائم ہے۔ اس قائم بالذات زندگی کی رمق، صرف تمہارے ہی حصے میں آئی ہے۔ اس لئے حیاتِ مستعار کے پیکرانِ آب و گل تمہاری اس زندہ قوت کا مقابلہ کس طرح کر سکتے ہیں۔
>
> نورِ قدیمی شب را برافروز　　دستِ کلیمی در آستینی!

قومی اخبارات کی بے ضمیری

۱۹۵۵ء کا شمارہ ہمارے سامنے آتا ہے اور اس کا افتتاحیہ ہمارے اخبارات کی اس خوشامدانہ روش پر ماتم کناں ہے جو اربابِ اقتدار کے لئے خود فریبی اور خودسری کے سامان مہیا کرتی ہے چنانچہ اس سلسلے میں طلوعِ اسلام نے سب سے پہلے شاہی درباروں کے ان حضوریوں کی مثال پیش کی جن کی خوشامدانہ روش نے حکومتوں کو تباہ کیا اور پھر بتایا کہ

آج بھی اسی قسم کے آقا موجود ہیں اور اسی قسم کے مصاحب ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اب اس قسم کا کام پریس (اخبارات) نے لے لیا ہے ۔ روح وہی ہے صرف پیکروں کی تبدیلی ہوئی ہے ۔

..... ان کی کیفیت یہ ہے کہ کوئی اسکیم، کوئی تجویز ارباب اقتدار کی طرف سے آئے، ابھی آدھا فقرہ ان کی زبان میں ہوگا کہ ان کی طرف سے سبحان اللہ اور مرحبا کا شور اس طرح بلند ہونا شروع ہو جائے گا جیسے مشاعروں میں کسی استاد کے شاگرد اس کے آدھے مصرع پر تحسین و آفریں کا شور مچا دیتے ہیں ۔ ان کی تقریروں کا ایک ایک فقرہ آسمان تک اچھالا جائے گا اور خواہ اس میں زبان تک کی بھی غلطیاں کیوں نہ ہوں، انہیں وحی آسمانی کی طرح بے مثل و بے نظیر قرار دیا جائے گا ۔ خواہ ساری دنیا انہیں گالیاں دے رہی ہو، یہ انہیں ملت کا محبوب ترین لیڈر کہہ کر پکاریں گے کہیں ان کا جلوس نکلے گا تو ان کے ساتھ خواہ بھرتی کے خدمت گزار اور حاشیہ بردار پا بجولاں، کشاں کشاں کیوں نہ جا رہے ہوں ۔ ان کی رپورٹ سے معلوم ہوگا کہ از فرش تا عرش "ملائکہ" قطار در قطار ان کے جلوس میں چلے جا رہے تھے ۔ کسی کانفرنس میں حاضرین نے انہیں خواہ تقریر کے لئے اٹھنے تک نہ دیا ہو، رپورٹ بتائے گی کہ دو لاکھ کے مجمع نے فلک بوس نعروں سے ان کا استقبال کیا ..... جب تک وہ برسر اقتدار رہے گا "سب تعریفیں" اس کیلئے مختص ہوں گی، اور اگر ایسا ہوا کہ اقتدار کی کرسی اس سے چھن گئی تو دوسرے ہی دن اس کی ایک ایک برائی چن چن کر سامنے لائی جائے گی ۔ اور اس جنازہ خوانی کے بعد اسے پھر اسی لحد کے خاموش گوشے میں سلا دیا جائے گا جہاں وہ پہلے پڑا تھا ۔ (دسمبر ۱۹۵۲ء ۔ ص۶)

معاملہ اسی پر بس نہیں ہوتا بلکہ قوم کے ان "ترجمانوں" کی خوشامدانہ روش اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ اگر کوئی شخص (دینی بدبختی سے) اتنا کہنے کی جرأت کر بیٹھا کہ فلاں معاملہ میں فلاں کمزوری نظر آتی ہے تو مصاحبوں کا یہ ٹولہ چاروں طرف سے قینچیاں ہاتھ میں لئے اس طرح یورش کر کے آگے بڑھتا ہے کہ ایسا کہنے والے کی زبان کاٹ لی جائے ۔ کوئی اسے غدار وطن قرار دیتا ہے اور کوئی اسلام کا دشمن ۔ اس کے خلاف یوں ہنگامہ آرائی کی جاتی ہے اور آقائے نعمت کو یہ کہہ کر فریب نفس میں مبتلا کر دیا جاتا ہے کہ آپ ان باتوں کی قطعاً پرواہ نہ کیجئے ۔ آپ ملت کی آنکھ کا تارا ہیں ۔ اور پوری قوم آپ کے قدموں پر جاں نثاری کرنے کے لئے، سر بکف منتظر کھڑی ہے ۔

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ یہی مصاحب ہیں جن کی وجہ سے افراد تباہ ہوتے اور قومیں ڈوبتی ہیں ۔ (ایضاً ۔ ص۷)

قرآن کی زبان سے، اس روش کے تباہ کن نتائج کی وضاحت کرنے کے بعد طلوعِ اسلام نے لکھا۔

اگر یہ قوم ضابطۂ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتی تو نہ ہی ان مصاحبین کی مجال تھی کہ اہل حل و عقد کو اس طرح فریب میں مبتلا رکھتے اور نہ ہی ان ارباب اقتدار کو اس کی جرات ہوتی کہ وہ اس طرح فریب نفس میں مبتلا ہو جاتے۔ اس وقت قوم کا ہر فرد ارباب اقتدار کی ہر نقل و حرکت کا محاسب ہوتا اور جونہی اس کا کوئی قدم قرآن کے راستے سے ادھر اُدھر ہونے لگتا چاروں طرف سے خبردار اور ہوشیار کی آواز آتی۔ (ایضاً۔ صفـ)

اور اس طرح قرآنی حقیقت کو واضح طور پر پیش کرنے کے اس نے ارباب اقتدار کو بتایا کہ

جب تک ہمارے ارباب حل و عقد، حضرت عمرؓ کی طرح، راتوں کو بھیس بدل کر اپنی آنکھوں سے یہ نہیں دیکھیں گے کہ قوم کی حالت کیا ہے اور اپنے کانوں سے نہیں سنیں گے کہ ـــــ کہتی ہے ان کو خلق خدا غائبانہ کیا ـــــ اور جب تک قوم کا ہر فرد (عہدِ فاروقیؓ کی) اس بڑھیا جیسی جرات اپنے اندر نہیں رکھے گا کہ وہ ارباب حل و عقد کو بتا سکے کہ خلافت اور بادشاہت میں کیا فرق ہے۔ اس وقت تک یہ مصاحبین، ارباب اقتدار کو برابر فریب میں مبتلا رکھیں گے اور ارباب اقتدار دیکھتے بوجھتے برابر فریب کھاتے چلے جائیں گے۔ اس لئے کہ فریب میں بڑی لذت ہوتی ہے۔ اور حقائق کا سامنا کرنے کے لئے بڑے کیرکٹر کی ضرورت ہوتی ہے۔

(ایضاً ـ صفـ)

مفت

دوا برائے دمہ و درد گردہ و پتھری

ملنے کا پتہ:۔ حاجی محمد دین شیخ آئل فیکٹری متصل گنیش کھوپرا ملز، لارنس روڈ کراچی

اپنے پتہ کا لفافہ بھیج کر دوا مفت منگالیں

محترمہ شاہدہ حسین برترانی صاحبہ

سرسید کے زمانے میں مسلمانوں کی حالت

(بہ شکریہ ماہنامہ ثقافت ۔لاہور)

ہندوستان پر مسلمانوں نے سات سو برس تک حکومت کی اور ان کے کارناموں نے دنیا کی تاریخ میں اس ملک کو بھی باعزت اور باوقار بنا دیا۔ مسلمان ہندوستان میں اجنبی نہیں بنے رہے۔ بلکہ یہاں کی ایک قوم بن گئے اور نہ صرف سیاسی و معاشی برتری بلکہ اعلیٰ تہذیب و تمدن، ذاتی اوصاف اور قومی خصوصیات کے اعتبار سے بھی وہ ہندوستانی معاشرہ میں سب سے زیادہ معزز و ممتاز رہے اور ان کی یہ فضیلت و برتری صدیوں تک قائم رہی۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندوستان کی حالت نہ صرف سیاسی اعتبار سے انتہائی خراب تھی بلکہ تہذیب و تمدن اور طرزِ معاشرت کے لحاظ سے بھی یہ ملک نہایت پستی کی حالت میں تھا۔ اور ہندوستانی معاشرہ بحیثیت مجموعی ایک نیم وحشی معاشرہ تھا جس میں ذات پات، چھوت چھات، ستی، دختر کشی اور حیوان پرستی جیسے غیر مہذب طریقے نہ صرف رائج تھے، بلکہ یہ معاشرہ کی اساس بھی تھے اور ان کو تقدس و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ مسلمان ہندوستانی معاشرہ کی ان خرابیوں کو پوری طرح ختم نہ کر سکے۔ کیونکہ ان کو مذہبی تائید حاصل تھی، چنانچہ انگریزی دورِ حکومت میں بھی ان بری رسموں میں سے صرف ستی اور دختر کشی کو بمشکل تمام ختم کیا جا سکا اور دوسری رسمیں اب تک جاری ہیں یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے عہد میں بھی عام معاشرہ میں کوئی فوری اور بڑا انقلاب نہ ہو سکا۔ لیکن اعلیٰ اور متوسط طبقوں نے جن میں مسلمانوں کی بڑی اکثریت شامل تھی حیرت انگیز ترقی کی۔ اور مسلمان فرماں رواؤں اور ان کے امراء کے تمدنی کارنامے تو اس قدر عظیم الشان تھے۔ کہ ان کی بدولت ہندوستان بھی اس زمانے کے مہذب ترین ممالک

میں شمار ہونے لگا۔[۱] جب تک مسلمان حکمران اور ترقی پذیر رہے ان کی یہ امتیازی حیثیت بھی قائم رہی لیکن جب ان کو زوال ہونے لگا۔ تو ان میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ حکومت سے محرومی اور انگریزوں کی حکومی نے ان کو بالکل تباہ و برباد کر دیا اور ان کا مستقبل نہایت تاریک نظر آنے لگا۔

مسلمانوں کا زوال

مسلمانوں کی زندگی میں جو نقائص پیدا ہو گئے تھے وہ ان کے زوال کا سبب بنے اور ان میں سب سے زیادہ نقصان رساں وہ معاشرتی خرابیاں تھیں جن کی جڑیں رفتہ رفتہ بہت گہری اور مضبوط ہو گئی تھیں۔ مسلمانوں میں یہ خرابیاں ان کے سیاسی زوال سے پہلے ہی پیدا ہونے لگی تھیں اور آخر کار یہ اتنی عام ہو گئیں کہ پورا معاشرہ ان سے متاثر ہو گیا اور یہ خرابیاں بھی مسلم قوم کے زوال کا بنیادی سبب بن گئیں۔ ہندوؤں کے معاشرتی اثرات، ان کے عقائد و نظریات، رسوم و رواج اور توہمات اور طرزِ معاشرت نے مسلمانوں پر رفتہ رفتہ اتنا اثر ڈالا کہ ہندوستانی مسلمانوں کا معاشرہ اسلامی خصوصیات سے بڑی حد تک محروم ہو گیا، اور زندگی کے اہم شعبوں پر غیر اسلامی اثرات غالب آ گئے۔ انگریزوں کے عہدِ حکومت میں ہندو قوم میں کئی نامور مصلح پیدا ہوئے جن کی کوششوں سے ہندوؤں نے اپنی معاشرتی حالت درست کرنے پر توجہ کی اور حالات سے پورا فائدہ اٹھایا۔ لیکن ان کے برعکس مسلمان زمانے کے تقاضوں سے بالکل غافل رہے اور اپنی حالت بہتر بنانے پر کوئی توجہ نہ کی جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ بدلے ہوئے حالات نے مسلمانوں کی معاشرتی حالت کو بد سے بدتر بنا دیا اور ان کے معاشرتی عیوب پہلے سے بہت زیادہ نقصان رساں ہو گئے۔

سیاسی زوال کی وجہ سے مسلمانوں کا معاشرتی وقار بہت گر گیا تھا۔ حکومت، عہدے اور جاگیر و منصب ان کی معاشرتی برتری اور معاشی خوشحالی کا ذریعہ تھے۔ اور جب مسلمان ان ذرائع سے محروم ہو گئے تو ان کی اقتصادی حالت بھی خراب ہو گئی۔ حکومت اور سلطنت چھن جانے سے وہ اپنے معاشرتی مرتبے سے اس طرح گرے کہ اپنی محکوم قوموں کی سطح پر آ گئے اور ایک ایسی یورپی قوم کے محکوم بنے جو ان کو شک و شبہ اور خطرہ کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اور اسی بناء پر مسلمانوں کے مقابلے میں ان قوموں کو ترجیح دیتی تھی، جو صدیوں مسلمانوں کی محکوم رہ چکی تھیں۔ انگریزوں کو یہ اندیشہ تھا کہ مسلمان اپنا کھویا ہوا اقتدار حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اور ۱۸۵۷ء کی شورشِ عظیم سے انھوں نے

---

[۱] اس میں شبہ نہیں کہ تمدنی حیثیت سے یہ دور ہندوستان کے سابقہ دور سے کہیں ممتاز رہا، لیکن مسلمان حکمرانوں نے دین کی طرف بہت کم توجہ دی جس کی وجہ سے انسانیت کا درجہ اس دور میں بھی بلند نہ ہو سکا۔ اگر یہاں مسلمانوں کی حکومت کی جگہ دین کی حکومت قائم ہو جاتی تو آج دنیا کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ (طلوعِ اسلام)

یہ نتیجہ نکالا کہ مسلمانوں کی طرف سے ان کے تمام اندیشے بالکل درست تھے، چنانچہ انھوں نے آئندہ خطرات کا انسداد کرنے کے خیال سے مسلمانوں کو ہر طرح سے تباہ و برباد کر دیا۔ ہزاروں لوگ جو مختلف حیثیتوں سے سربرآوردہ تھے موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ باعزت لوگ بے عزت کئے گئے۔ دولت مند اور خوشحال گھرانے مفلس و محتاج بنا دیئے گئے۔ اور جذبۂ انتقام کو ٹھنڈا کرنے کے لئے پوری مسلم قوم کو ظلم و ستم کا شکار بنا کر ایسے مصائب و آلام میں مبتلا کر دیا جن سے نجات پانے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی[1]۔ اس طرح وہ قوم جو ہندوستانی معاشرہ میں صدیوں تک معزز و ممتاز اور باوقار رہی ذلیل و خوار ہو گئی اور اس کی مکمل تباہی یقینی معلوم ہونے لگی۔ اس تباہی سے بچنے کے لئے مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر جن اوصاف و خصوصیات کی ضرورت تھی وہ ان میں باقی نہ رہے تھے اور ان کو پھر پیدا کرنا نہایت اہم اور ضروری لیکن انتہائی مشکل کام تھا۔

مسلم معاشرہ کی عام کیفیت

ہندوستانی مسلمانوں کو مکمل تباہی سے بچانے کے لئے ان کے پورے معاشرہ کی اصلاح کرنا لازمی تھا جس کو غیر اسلامی اثرات، رسوم و رواج اور توہمات نے بالکل بگاڑ دیا تھا۔ اور خود مسلمانوں کے غلط رجحانات نے بھی اس کی صورت مسخ کر دی تھی۔ ذات پات کی تفریق، فرقہ واری اختلاف اور تعصب و تنگ نظری نے ملی اتحاد اور معاشرتی ہم آہنگی کو ختم کر دیا تھا۔ اور مختلف فرقے ایک دوسرے کو اسلام سے خارج قرار دیتے تھے۔ عورتوں کی محکومی، جنسی تلفی اور جہالت اور کثرتِ ازدواج جیسی بری رسموں نے پورے معاشرہ پر تباہ کن اثر ڈالا تھا۔ اور غلامی کے انسداد کی تحریک عام ہو جانے کے باوجود لونڈی غلام رکھنے کا طریقہ ملک کے بہت سے حصوں میں باقی تھا۔ شادی غمی ہر موقع پر بری رسموں اور رواج کی پابندی شدت سے کی جاتی تھی جن سے معاشرتی اور معاشی ہر لحاظ سے نقصان ہوتا تھا۔ چھوت چھات کا اثر اس قدر پڑا تھا کہ عیسائیوں کے ساتھ کھانا پینا بھی مذہب کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ اس زمانے میں بھی مسلمانوں کو اپنے مذہب سے بڑی محبت رہی لیکن عقائد کی خرابی نے مذہب کی شکل بھی بگاڑ دی چنانچہ اسلام کے بنیادی اصول و مقاصد تو نظر انداز کر دیئے گئے۔ اور فروعات کو اصل دین سمجھ کر گمراہ کن عقائد کی پیروی کی جانے لگی۔ اسلام اور بانیٔ اسلام سے غلط باتیں منسوب کر کے ان کی اتباع کو دینداری قرار دیا جاتا تھا۔ اور اصل دین کی پیروی کرنے کا خیال تک نہ آتا تھا۔ دین کو دنیا سے الگ کر کے محض اوراد و وظائف کو عبادت تصور کیا جاتا تھا۔ اور یہ حقیقت بالکل فراموش کر دی گئی تھی کہ اسلام ایک مکمل دین اور نظریۂ حیات ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی حاصل کرنے کے لئے ہے۔

---

[1] اس مقصد کے لئے ہندوؤں نے بھی انگریزوں کا پورا پورا ساتھ دیا اور مسلمانوں کی تباہی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ (طلوعِ اسلام)

تقلید پرستی نے غور و فکر اور اجتہاد کرنے کی راہیں بند کر دی تھیں، اور ہیری مریدی کی بگڑی شکل[1] نے ایک ایسا گمراہ کن مذہبی طبقہ بنا دیا تھا جو دین اور دنیا دونوں کو برباد کر رہا تھا۔ اخلاق و عادات کے اعتبار سے بھی پوری قوم کی حالت بہت خراب تھی۔ تعصب و تنگ نظری باہمی مخالفت و عداوت خوشامد، پندی، جھوٹی شان و شوکت کا اظہار، ماضی اور اسلاف پر بے جا ناز، قدامت پرستی میں شدت، اصلاح و ترقی سے نفرت، جدوجہد سے گریز اور مایوسی و الم پسندی جیسی تباہ کن خرابیاں خصلت و عادت بن گئی تھیں۔ معاشرہ کی ان تمام خرابیوں کی اصلاح کرنے کی موثر ترین تدبیر یہ ہو سکتی تھی کہ تعلیم کی اشاعت کر کے لوگوں میں اپنی حالت کا شعور اور ترقی کا احساس پیدا کیا جائے۔ لیکن اس راستے میں بھی بڑی دشواریاں حائل تھیں۔ عوام بالکل جاہل تھے۔ اور جن لوگوں نے تعلیم پائی تھی وہ صحیح تعلیم اور اچھی تربیت سے بالکل محروم رہے تھے۔ تعلیم کا طریقہ نہایت ناقص تھا اور جن علوم کی تعلیم دی جاتی تھی اور جو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں وہ اس زمانے کے لئے بالکل بے فائدہ اور بے کار تھیں۔ آبا و اجداد کے پرانے علوم پر بڑا ناز تھا اور اس بات کا پتہ تک نہ تھا کہ اس کے بعد سینکڑوں سال کے دوران میں ان علوم نے کس قدر ترقی کر لی ہے جدید علوم کی نوعیت کیا ہے اور اس کے کیا فوائد ہیں اس سے تو مطلق واقفیت نہ تھی لیکن جہالت کا یہ عالم تھا کہ لوگ ان سے نفرت کرتے اور ان کو ناپاک سمجھتے تھے۔ اور اس کے خلاف ان کا تعصب اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ جب حکومت نے ہندوستان میں انگریزی تعلیم جاری کی تو ہندوؤں نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا لیکن مسلمانوں نے آٹھ ہزار مسلمان رئیسوں اور عالموں کے دستخطوں سے حکومت کو ایک محضر پیش کیا جس میں انگریزی کی تعلیم[2] سے اختلاف کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ حکومت اس طریقے سے ہندوستانیوں کو عیسائی بنانا چاہتی ہے۔ ایسے ناموافق اور دشوار حالات میں معاشرہ کی اصلاح کرنا بہت بڑا اور بہت مشکل کام تھا۔ اور اس کے لئے ایسے مصلحین کی ضرورت تھی جو غیر معمولی اوصاف اور صلاحیتوں کے مالک ہوں، جن کے دل میں قوم کا سچا درد اور خلوص ہو جو قوم کے امراض کی صحیح تشخیص کر کے ان کو دور کرنے کی موثر تدبیریں اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور جو ہر قسم کی مخالفت اور رکاوٹ کے باوجود معاشرہ کی اصلاح و ترقی کے لئے پورے عزم و استقلال سے اپنی جدوجہد کو کامیاب بنا سکیں۔

سرسید کے تاثرات

قومی زوال و ادبار کے اس نازک دور میں ہندوستانی مسلمانوں کو خوش قسمتی سے سرسید احمد خاں جیسا عظیم مصلح اور رہنما مل گیا جن کی کوششوں نے تباہی کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے مسلم قوم کو بچا لیا۔ سرسید کی اصلاحی سرگرمیوں نے ایک

---

[1] اس کی کوئی سنوری ہوئی شکل ہوتی ہی نہیں۔ (طلوعِ اسلام)

[2] مذہب پرست طبقہ میں (انگریزی تو نہیں لیکن) انگریزی خوانوں کے خلاف نفرت کا جذبہ اب بھی کچھ کم نہیں۔ (طلوعِ اسلام)

منظم تحریک کی شکل اختیار کر لی جو انتہائی نامواقف حالات کے باوجود اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئی اور ہندوستان کے مسلمان معاشرتی اصلاح اور قومی ترقی کے راستے پر گامزن ہو گئے۔

سرسید نے جس قوم کی ہر جہتی معاشرتی اصلاح اور ترقی کا مشکل کام اپنے ذمہ لیا اور اس کو زوال و پستی کی حالت سے نکال کر ترقی دینے کی کوشش کی وہ کس حال میں تھی اور اس کے لئے کن کن اصلاحات کی ضرورت تھی۔ اس سے وہ بخوبی واقف تھے چنانچہ اپنی متعدد تحریروں اور تقریروں میں انھوں نے اس دور کے مسلمانوں کی جو کیفیت بیان کی ہے اس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ پوری قوم کی زندگی کے ہر شعبہ میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں اور ذہنی، اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی ہر اعتبار سے تمام طبقوں کا جو برا حال تھا۔ ان سب کا سرسید نے بہت غور سے مطالعہ کیا تھا۔ اور ان کے تاثرات یہ تھے۔ کہ اس ملک میں ہماری قوم کا حال نہایت بدتر ہے۔ اگر ہماری قوم میں صرف جہالت ہی ہوتی تو چنداں مشکل نہ تھی مشکل تو یہ ہے کہ قوم کی قوم جہل مرکب میں مبتلا ہے۔ علوم جن کا رواج ہماری قوم میں تھا یا ہے اور جس کے تکبر و غرور سے ہر ایک پھولا ہوا ہے دین و دنیا دونوں میں بکار آمد نہیں۔ علم ادب و انشاء کی خوبی صرف لفظوں کے جمع کرنے اور ہموزن کلموں کے ملک ملانے اور دور از کار خیالات بیان کرنے اور مبالغہ آمیز باتوں کے لکھنے پر منحصر ہے۔ فن شاعری جیسا ہمارے زمانے میں خراب اور ناقص ہے اس سے زیادہ کوئی چیز بری نہ ہوگی مضمون تو بجز عاشقانہ کے اور کچھ نہیں ہوتا اور وہ بھی نیک جذبات انسانی کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ ان جذبات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو تہذیب و اخلاق کے خلاف ہیں۔ علم دین تو وہ خراب ہوا ہے کہ جس کی کوئی حد نہیں۔ اس معصوم، سیدھے سادے سچے اور نیک طبیعت والے پیغمبر نے جو خدا کے احکام بہت سادگی، صفائی اور بے تکلفی سے جاہل اَن پڑھ بادیہ نشین عرب کی قوم کو پہنچائے تھے اس میں وہ نکتہ چینیاں اور باریکیاں گھسیڑی گئیں اور وہ مسائل فلسفیہ اور دلائل منطقیہ ملائی گئیں کہ اس میں اس سچائی، صفائی اور سادگی کا مطلق اثر نہیں رہا۔ یہ مجبوری لوگوں کو اصلی احکام کو جو قرآن اور معتمد حدیثوں میں تھے چھوڑنا پڑا اور زید و عمرو کے بنائے ہوئے اصول کی پیروی کرنی پڑی۔ علم مجلس اور اخلاق اور برتاؤ دوستی کا ایک ایسے طریقے پر پڑ گیا ہے جو نفاق سے بھی بدتر ہے۔ اخلاق صرف منہ پر میٹھی میٹھی باتیں بنانے اور اوپری تپاک جتانے کا نام ہے۔ اب مکاری اور ظاہرداری کا نام اخلاق رہ گیا ہے۔ اور بے ایمانی اور دغابازی کا نام ہوشیاری۔ گفتگو پر خیال کرو تو عجیب حالت دکھائی دیتی ہے۔ ہزاروں اکھڑ مضمون زبان سے نکلتے ہیں۔ نہایت مہذب اور معقول و ثقہ اور نیک و دیندار آدمی بھی اپنی گفتگو میں تہذیب و شائستگی کا مطلق خیال نہیں کرتے۔ اگر اشراف جوان دوستوں کی محفل میں جاؤ تو سنو کہ وہ آپس میں کیسی گالم گلوچ اور فحش باتیں ایک دوسرے کی نسبت کرتے ہیں۔ امیروں کا حال دیکھو تو ان کو دن رات بٹیر لڑانے اور مرغ لڑانے اور کبوتر اڑانے اور اسی طرح تمام لغویات میں اپنی زندگی بسر کرنے کے سوا اور کچھ کام دھندا نہیں۔ اور مذہبی طبقہ کا یہ حال کہ کینہ و نخوت اور اپنے تقدس و بزرگی اور خدا پرست ہونے کا گھمنڈ

مقدس لوگوں میں کوٹ کوٹ کر بھرا پاؤ گے اور اگر دنیا میں شیطان کو ڈھونڈتے پھرو تو بجز مقدسین کے جبہ و دستارِ مبارک کے اور کہیں پتہ نہیں ملے گا[1]۔

عوام کی اقتصادی بدحالی

اس زمانے میں مسلمانوں کی اقتصادی حالت بھی کس قدر خراب ہو گئی تھی اس کا اندازہ عید جیسے خوشی کے تہوار کی اس کیفیت سے ہو سکتا ہے جس کا نقشہ سرسید نے اس طرح کھینچا ہے "عیدگاہ میں بڑا اژدہام خلائق کا تھا۔ تل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ دھوپ میں غضب کی تیزی آ گئی تھی۔ عیدگاہ میں پورا فرش تو ہے نہیں اور لوگوں کو اتنا مقدور نہیں کہ مصلے خریدیں۔ ہزاروں آدمی دھوپ میں بیٹھے ہوئے تھے ۔ ۔ ۔ وہاں ہزاروں مسلمان تھے۔ مگر ایک سے ایک بدتر حالت میں۔ مسلمانوں میں عید کا دن بڑی خوشی کا دن ہے۔ ہر ایک مسلمان اپنے مقدور بھر اچھے سے اچھے کپڑے پہنتا ہے۔ پنہاری بھی دو دو کوڑی جمع کر کے عید کے لئے اپنے بچے کو نیا جوڑا بنا دیتی ہے۔ عیدگاہ میں میں نے ہزاروں پر نظر ڈالی کسی کے گلے میں بجز گزی اور دھوتر کے کچھ نہیں دیکھا۔ کپڑے تو سب کے دھوئے ہوئے اور اجلے تھے۔ مگر ہزاروں آدمیوں کے انگرکھوں میں پیوند لگے تھے۔ اگر کسی کے تن میں گزی کا نیا انگا تھا تو یقین جانیئے پرانا پاجامہ تھا جس میں قلعی کے سے چھید تھے۔ جوتے تو کسی کے پاؤں میں ثابت نہ تھے۔ بہتوں نے رسی یا چیتھڑے سے باندھ لیئے تھے کیونکہ پاؤں سے نکل نکل جاتے تھے۔ بڑے بوڑھوں کا کچھ ذکر نہیں بچوں کو عید کے دن اچھے اچھے کپڑے پہننے کا اور کھلونوں کے لینے کا بڑا شوق ہوتا ہے لیکن کسی بچے کا یکساں لباس نہ تھا۔ اگر سر پہ جھوٹے گوٹے کی ٹوپی تھی تو پاؤں میں جوتا نہیں۔ پاجامہ نیا تو انگا پرانا ہے ہر ایک آدمی پر ایسے مبارک اور خوشی کے دن میں بھی نہایت افلاس اور مصیبت برستی تھی کسی کا دل اندر سے خوش نہ تھا ہر ایک غمگین، روتی صورت، بے رونق شکل، تیوری چڑھی ہوئی، داڑھی پر گرد پڑی ہوئی، پیادہ پا چلنے سے پسینے میں شرابور، سب نہایت پریشان، اور متفکر نظر آتے تھے۔ عیدگاہ کے باہر ایک غول بھیک منگوں کا تھا جو دو دو کوڑی مانگتے تھے اور پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ بیسیوں مسلمان سڑک پر کپڑا بچھائے بیٹھے تھے اور پکار رہے تھے "کچھ خیرات دیتے جاؤ نیکیوں، روزے قبول"۔ ایک طرف سینکڑوں عورتوں کا غول تھا۔ اور ان میں بیسیوں برقعہ اوڑھے چلا رہی تھیں۔ کہ اے بیٹا ہم سیدانی ہیں فاطمہ بی بی کا واسطہ کھانے والی ہیں اشراف گھرانے کی ہیں۔ ہم پر مصیبت پڑی ہے۔ اپنے بال بچوں کا صدقہ، خاتونِ جنت کا صدقہ کچھ دیتے جاؤ"[2]۔

مفلس و محتاج مسلمانوں کے برعکس ہندوؤں کی کیا حالت تھی۔ اس کا اندازہ ان لوگوں کی خوشحالی سے کیا جا سکتا ہے جو عید کا تماشا دیکھنے آئے تھے اور جن کی کیفیت سرسید نے یوں بیان کی ہے "دو چار نوجوان ہندو بھی نہایت عمدہ گھوڑوں پہ

---

[1] تہذیب اخلاق صفحہ ۴۵ [2] آج بھی ہماری عید کا نقشہ اس سے مختلف نہیں ہوتا۔ (طلوعِ اسلام)

سنہری روپہلی ساز لگائے ہوئے، کارچوبی ناشیہ گھوڑوں پر ڈالے ہوئے نہایت عمدہ نفیس کپڑے پہنے، زمرد و یاقوت اور موتیوں کی مالائیں اور کنٹھے گلے میں ڈالے ہوئے نہایت نفیس سرخ رنگ اور طلائی تُمہ کا چیرہ باندھے ہوئے سیر کرتے پھرتے تھے۔ سیاہ نفیس دو دو اشرفی کا ولایت کا بنا ہوا بوٹ، سفید پتلون اور کالا کوٹ اور دُغلیا ٹوپی پہنے، ہاتھ میں خوبصورت پتلی سی پھوندنا پڑی چھڑی لئے، انگریزی میں غٹ پٹ کرتے، لوگوں کو دیکھ کر مسکراتے پھرتے تھے۔ گھوڑوں کے آگے تین چار مسلمان بھی دکھائی دیئے جو کچھ آسودہ حال معلوم ہوتے تھے۔ جب پوچھا کہ یہ کون ہیں تو معلوم ہوا کہ لالہ چھٹا مل کے بیٹے بھی سیر کو آئے ہیں اور یہ ان کے سائیس ہیں۔ انھوں نے عید سے پہلے کہا تھا کہ مہاراج ہمارا تہوار ہے اگر تنخواہ پیشگی مل جائے تو بڑی پرورش ہوگی۔ مہاراج نے رونگ پیٹے کو کہا تھا کہ یہ مسلا تہوار تہوار پکار رہا ہے۔ آٹھ روپیہ بیاج کا کاٹ کر اس مُسلے کو پیشگی تنخواہ دیدو۔"[1] سرسید کے ذہن نے عید کی جو یہ قلمی تصویر کھینچی ہے وہ ایسی دو قوموں کا صحیح عکس ہے جن میں سے ایک جو اس ملک پر صدیوں حکومت کر چکی تھی اپنی معاشرتی حالت کو بگاڑ کر نکبت و افلاس کا شکار بن گئی تھی اور دوسری جو صدیوں سے معاشرتی پستی اور سیاسی محکومی میں زندگی گزار رہی تھی زمانے کے تقاضوں کے مطابق اپنے معاشرہ کی اصلاح کر کے خوشحال ہوگئی تھی۔

دولت مندوں کی خود نمائی

عام مسلمانوں کا تو یہ حال تھا اور جو لوگ خوش حال تھے وہ نمود و نمائش کے پیچھے پڑے ہوئے تھے اور مذہب اور قوم کی خدمت سمجھ کر جو روپیہ صرف کرتے تھے وہ بھی در اصل ضائع ہو جاتا تھا۔ بمبئی کے میمن جو تجارت کرتے تھے اور بہت خوشحال تھے ان کی بھی ایسی ہی حالت تھی۔ دوران کے متعلق سرسید نے یہ خیال ظاہر کیا کہ "میمنوں نے بجز اس کے کہ اچھے کپڑے پہنتے ہیں اور عربی عمامے باندھتے ہیں۔ اور بگھیوں میں چڑھتے ہیں اور اپنے نام اور اپنی شیخی کے پیچھے مرتے ہیں اور کچھ قومی ترقی نہیں کی۔ ان کو مسجد بنانے کا بڑا شوق ہے۔ بہت سے میمن ہیں جن کے ہاں تھوڑا تھوڑا لنگر خانہ جاری ہے۔ اور ان کی نام آوری کے لئے برائے نام ایک مدرسہ بھی ہے۔ ایک مُلّا اس میں پڑھانے کو نوکر ہے۔ پندرہ بانغ برائے نام طالب علم ہیں لنگر خانے سے روٹی پلتے ہیں۔ دن کو ایک آدھ برائے نام سبق پڑھ لیا اور پھر کسی میمن کے لڑکے کو پڑھانے چلے گئے۔ اور کوئی شخص کسی اور طرح سے خیرات مانگنے کا پیشہ کرنے چلا گیا۔ مجھ کو یہ حال دریافت ہونے سے نہایت افسوس ہوا اور میں نے کہا دیکھو قوم کا جو ادبار ہے تو باوجودیکہ روپیہ خرچ ہوتا ہے مگر کس بُری طرح خرچ ہوتا ہے جس سے نہ دین کا فائدہ نہ دنیا کا۔ البتہ صرف چند روزہ ایک نام ہے کہ فلاں میمن کا مدرسہ ہے۔ علاوہ اس کے دو کٹ ملّا خوشامدیوں نے تعریف کر دی اور کہا کہ آپ نے

[1] مضامین تہذیب و اخلاق ص ۵۳

جنت میں ایک موتی کا محل بنا لیا۔ لعنت اللہ علی الکاذبین۔ وہ لوگ مر گئے جو موتی کا گھر بناتے تھے ایسی باتوں سے تو پھوٹی کوڑی کا بھی گھر نہیں بنتا۔[1]

جدید اور مفید تعلیم سے محرومی

مسلمانوں کی اس بری حالت کو درست کرنے کا نہایت موثر ذریعہ یہ ہو سکتا تھا کہ تعلیم کو فروغ دیا جائے لیکن تمام مسلمان انگریزی اور جدید علوم کی تعلیم سے اس قدر متنفر تھے کہ ۱۸۶۹ء میں بھی جب کہ ہندوستان میں انگریزی تعلیم بہت ترقی کر چکی تھی پورے ملک میں مسلمان گریجویٹس کی تعداد صرف بیس تھی جن میں سے سترہ بی۔ اے تھے اور صرف تین ایم اے تھے[2] اور جیسا کہ سر سید نے محسن الملک کو لکھا تھا مسلمانوں کی اس زبوں حالی کو بعض غیر مسلم بھی ان کے لیے بہت بڑا خطرہ تصور کرتے تھے چنانچہ الہ آباد کے اخبار پائنیر نے بھی یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ آج کل ہندوستان میں مسلمانوں کے اعلیٰ خاندان روز بروز گھٹتے جاتے ہیں اور تمام سلطنت کے ملازمین میں صرف بنگال میں چند مسلمان ہیں۔ وہ بھی ضعیف ہیں اور جلد پنشن لے لیں گے۔ اور ان کی جگہ یقیناً کوئی مسلمان نہیں ہوگا۔[3] لیکن مسلمان اس صورت حال سے غفلت برت رہے تھے۔ وہ اپنے قدیم علوم پر فخر کرتے اور ان کی تعلیم کو کافی سمجھتے تھے اور تعلیم کے بارے میں ان کا یہ عام رجحان بھی ان کی معاشرتی پستی اور افلاس کا ایک بڑا سبب بن گیا تھا چنانچہ تمام حالات پر غور کرنے کے بعد سر سید اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ "جو علوم مسلمانوں میں مروج ہیں وہ بلحاظ غیر مفید ہیں اور حسب احتیاج وقت نہیں ہیں اور یہی باعث ان کی مفلسی اور محتاجی کا ہے کیونکہ مفلسی کا اصل سبب جہل ہے اور غیر مفید علوم کا عالم اور جاہل دونوں برابر ہیں۔ اس لئے کہ ان سے لوگوں کو کچھ فائدہ پہنچتا ہے اور نہ وہ خود کچھ اپنا بھلا کر سکتے ہیں۔ جو تعلیم کہ حسب احتیاج وقت نہ ہو وہ غیر مفید ہوتی ہے اور جیسا کہ ایک عقلمند آدمی کا قول ہے اگر حسب احتیاج وقت لوگوں کی تعلیم و تربیت نہ ہو تو اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ لوگ اول مفلس اور محتاج اور پھر نالائق اور کاہل اور پھر ذلیل و خوار اور پھر چور و بدمعاش ہو جاتے ہیں۔"[4]

اس غلط رجحان کے علاوہ پوری قوم کو تعلیم دینے کی ضرورت سے بھی مسلمان ناواقف تھے اور کسی کو اس کا خیال نہ تھا۔ عوام میں اچھی بری کسی قسم کی بھی تعلیم حاصل کرنے کی نہ تو استطاعت تھی اور نہ اس کا انتظام تھا۔ سر سید کے نزدیک تعلیم معاشرہ کی اصلاح کا موثر ترین ذریعہ تھی۔ اور وہ چاہتے تھے کہ دولت مند مسلمان اس ضرورت کو محسوس کریں چنانچہ دولت مند طبقہ کو اس طرف متوجہ کرنے کے لئے انہوں نے یہ کہا تھا کہ "جب اولاد کی تعلیم و تربیت کا ذکر آتا ہے تو رئیسوں اور دولتمند

---

۱ مسافران لندن ص۱۰۵ ۲ حیات جاوید ص۲۲۸ ۳ مکتوبات سر سید ص۱۰۴

۴ مضامین تہذیب الاخلاق ص۲۲۴

کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہم اپنی اولاد کی تعلیم خاص اپنے اہتمام سے اور ہر ایک علم کے عالم نوکر رکھ کر بخوبی کر سکتے ہیں بعضوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہم کو اپنی ہی اولاد کی تعلیم و تربیت کی فکر کرنی کافی ہے۔ مگر یہ ایک بڑی غلطی ہے اور خود اپنی اولاد کے ساتھ دشمنی ہے۔ جہالت اور ناتربیتی وبا کی مانند ہوتی ہے جب تک تمام شہر اس بدبو سے پاک نہ ہوگا کوئی ایک گھر اپنے تئیں اس سے بچا نہیں سکتا۔[1]"

ہمدردوں کا غلط رویہ

مسلمان قوم کی حالت نہایت خراب ہو چکی تھی اور ان کے مستقبل کو زیادہ تاریک بنا دینے والی خرابی یہ تھی کہ پوری قوم کو اپنی زبوں حالی کا احساس اور ترقی کا خیال نہ تھا۔ کچھ لوگ ایسے تھے جو یہ تسلیم کرتے تھے کہ ترقی و اصلاح کی ضرورت ہے لیکن وہ اپنی برائیوں کی اصلاح کے بجائے دوسروں کی کمزوریاں بیان کر دینا کافی سمجھتے تھے۔ یہ طرزِ عمل بہت غلط تھا اور اس کے متعلق سرسید نے یہ خیال ظاہر کیا کہ "ہمارے بعض محبِ وطن جو دل سے اپنی قوم کی بھلائی اور قومی ترقی چاہتے ہیں، غلطی میں پڑ جاتے ہیں۔ جب کبھی ان کو کسی مہذب و تربیت یافتہ شائستہ قوم میں سے کسی کی کوئی وحشیانہ حرکت معلوم ہوتی ہے تو اس کو بہت طمطراق سے بیان کرتے اور لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب اس قوم میں بھی ایسی وحشیانہ حرکتیں ہوتی ہیں تو ہماری قوم کو کیوں برا کہا جاتا ہے[2] مگر ان کو سمجھنا چاہیئے کہ اگر ہم کسی دوسرے کی آنکھ کی پھلی کو ٹٹولیں تو اس سے ہماری آنکھ کا ٹینٹ نہیں چھپتا۔ ہم کو اپنی آنکھ کے ٹینٹ کا علاج کرنا چاہیئے۔ دوسرے کی آنکھ میں پھلی ہو یا نہ ہو۔ بایں ہمہ وہ لوگ اس بات میں ذرا انصاف بھی نظر نہیں کرتے اور قوم کی محبت انصاف کو چھپا دیتی ہے جس قوم کے کسی شخص کی وحشیانہ حرکت کی ہم گرفت کرتے ہیں اس وقت اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ اس قوم میں خوبیاں کتنی ہیں۔ ہماری قوم میں وہ عیب تو ہیں اور وہ خوبیاں کسی میں نہیں۔ اصلی محبت اور سچی خیر خواہی قوم کی یہی ہے کہ اس کے عیبوں کو دیکھے اور ان کے مٹانے کی فکر کرے۔ جو لوگ نہایت ہمدردی اور قومی محبت سے اپنی قوم کے عیبوں اور نقصانوں سے مطلع کرتے ہیں۔ ان کا دل اپنی قوم کی حالت پر بہ نسبت ان کے جو قوم کی طرف داری کرتے ہیں اور اس کے عیبوں کو چھپاتے ہیں بہت زیادہ جلتا ہے اور حقیقت میں وہی لوگ محبِ وطن اور محبِ قوم ہیں۔[3]"

سرسید اپنی قوم کے عیبوں پر پردہ ڈالنے والے محبِ وطن نہ تھے بلکہ وہ اپنی قوم کے ایسے محب اور خیر خواہ تھے۔ جو ان عیبوں کو مٹانا قوم کی صحیح خدمت تصور کرتے تھے اور جن کو قوم کی حالت بے چین و بے قرار کر دیتی تھی۔ اس لئے وہ قوم کی

---

[1] مجموعہ لیکچرز و اسپیچز تقریر پٹنہ مئی ۱۸۷۳ء [2] یہ لوگ اب بھی موجود ہیں اور دینی اس قسم کی تنقیدات کو قوم اور اسلام کی بہت بڑی خدمت سمجھتے ہیں [3] تہذیب الاخلاق جلد ششم۔

تباہ حالت کو دیکھ کر پکار اٹھے کہ "افسوس مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی ان کا نکالنے والا نہیں۔ ہائے افسوس! وہ امرت تھوکتے ہیں اور زہر نگلتے ہیں۔ ہائے افسوس! وہ ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اور مگر کے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں، اے بھائی فکر کرو! اور جان لو کہ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آگیا ہے اور اب ڈوبنے میں بہت ہی کم فاصلہ ہے"[1] قوم کی بھلائی کے لئے یہی تڑپ اور سچی محبت تھی جس نے سرسید کو معاشرہ کی ہر جہتی اصلاح و ترقی کی جد وجہد پر آمادہ کیا اور انہوں نے جدید اور مفید علوم کی اشاعت، دینی عقائد اور اخلاق و عادات کی درستی، رسوم و رواج اور طرز معاشرت کی اصلاح و ترقی اور مسلمانوں اور غیر مسلموں میں اتحاد و تعاون اور مذہبی رواداری کے فروغ جیسے اہم امور پر توجہ کرکے اپنی اصلاحی سرگرمیوں کو ایک ایسی منظم اور کامیاب تحریک بنا دیا جس سے مسلمانان ہند کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب پیدا ہو گیا۔ سرسید کی اصلاحی کوششوں میں سب سے اہم اور مفید محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام ہے جس نے آگے چل کر مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کرلی یہ ادارہ مسلمانوں کی نہ صرف تعلیمی ترقی کا ذریعہ بنا بلکہ پوری مسلم قوم کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ثابت ہوا اور اس کی بدولت مسلم قوم میں وہ بیداری پیدا ہو گئی جس نے ان کی جداگانہ قومیت کا تحفظ کیا اور وہ نہ صرف اپنے قومی وجود کو باقی رکھنے بلکہ اپنے لئے ایک الگ مملکت قائم کر لینے میں بھی کامیاب ہوئے۔

طلوع اسلام لیکن ہمارے ہاں ایسے لوگ بھی موجود ہیں کہ اس مملکت میں ٹھاٹھ سے زندگی بسر کر رہے ہیں اور جس سرسید کے صدقے یہ کچھ حاصل ہے اسے گالیاں دیتے ہیں، بڑی لذت لیتے ہیں! ایسی ناشکر گزار قوم بھی شاید ہی کہیں ملے۔

[1] مسافرانِ لندن ص ۲۵۵۔

خریداران طلوع اسلام کو اطلاع دی جاتی ہے کہ چندہ ختم ہونے پر انہیں متعلقہ پرچے میں ایک ریپلائی جوابی کارڈ (BUISNESS REPLY CARD) بھیجا جایا کرے گا۔ یہ کارڈ ایک لحاظ سے چندہ کے ختم ہونے کی اطلاع شمار ہوگا۔ ایسے خریداروں کو چاہیئے کہ آئندہ خریداری کے سلسلہ میں اس میں مناسب خانہ پری کرکے ادارہ کو واپس ارسال کر دیں۔ واضح رہے کہ اس کارڈ پر ٹکٹ لگانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ خرچ ادارہ کے ذمے ہوگا۔

(ناظم ادارہ)

(مسلسل)

اسلام پر مختلف ثقافتوں کے اثرات

(علامہ احمد امین مصری مرحوم)

(۴)

پروفیسر سائمن (SIMON) نے حنین اور جیش کی طرف سے جالینوس کی کتابوں کا ترجمہ شائع کرتے ہوئے ان کے ترجمہ پر نکتہ چینی کی ہے کہ ان دونوں کے ترجمے اضافی فقروں سے بھرے ہوئے ہیں جن کا اصل کتابوں میں نام و نشان بھی نہیں تھا۔ علاوہ ازیں ان دونوں کا طریقہ تعبیر لفظی ترجمہ کا ـــــ نمونہ ہے جو ہمیشہ خوشنما نہیں ہوا کرتا" پروفیسر برجستراسر نے اس تنقید کا جواب دیتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ حنین اور ان کے شاگرد جیش کو یونانی کتابوں کے اصل مضامین کو عربی زبان میں ادا کرنے میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ان کا مطمحِ نظر یہ تھا کہ جس قدر ممکن ہو وضاحت کے ساتھ ان مطالب کو ادا کر دیں۔ یہ دونوں حضرات لفظی ترجمہ کرتے تھے حتیٰ کہ بعض مرتبہ انھیں زبانوں کی خوبصورتی اور نظم کو بھی قربان کر دینا پڑتا تھا لیکن اس خصوصیت میں حنین کا ترجمہ زیادہ بہتر اور باریک بینی کا نمونہ ہے۔ ان تراجم کو دیکھ کر انسان کو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ صرف سچی کوشش ہی کا نتیجہ نہیں بلکہ زبان پر قدرت تامہ رکھنے اور اس میں عمدگی کے ساتھ تصرف کرنے کا بھی نتیجہ ہے۔ یہ بات اس وقت اور بھی واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ یونانی عبارت اور پھر اس کے عربی ترجمے کے درمیان کس قدر صحیح مطابقت ہے اور تعبیر میں کس قدر باریک بینی کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ اختصار کے ساتھ صحیح مطالب ادا ہو گئے ہیں۔ یہی وہ حنین کی فصاحت و بلاغت کے امتیازات ہیں جن کی وجہ سے ان کی شہرت ہے۔[1]

[1] پروفیسر برجستراسر کی کتاب ملاحظہ کیجئے جو انھوں نے حنین بن اسحاق اور ان کے مدرسہ کے متعلق لکھی ہے۔ ہم نے یہ تمام عبارت پروفیسر ماریوف کے مقدمہ سے نقل کی ہے جو انھوں نے حنین اسحاق کے "مقالات عشرہ" پر سپردِ قلم فرمایا ہے۔

جب ہم ان کتابوں کی فہرست دیکھتے ہیں جن کا حنین نے ترجمہ کیا یا خود تالیف کیں اور ان کتابوں کو دیکھتے ہیں کہ جن کا ذکر ابن ابی اصیبعہ نے اپنی کتاب "طبقات الاطباء" میں کیا ہے تو نظر آتا ہے کہ حنین نے بہت سے مختلف علوم پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان بے شمار کتابوں کے علاوہ جو انھوں نے فن طب پر لکھیں ان کی بہت سی کتابیں فلسفہ وغیرہ میں بھی تھیں۔ چنانچہ ہوا، پانی، اور مساکن" کے سلسلے میں ان کی ایک کتاب ہے "مرغی کے بچوں کی پیدائش" پر ان کی ایک کتاب ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ مرغی کے بچوں کی پیدائش انڈے کی سفیدی سے ہوتی ہے۔ اور بچہ اس زردی سے جو انڈے میں ہوتی ہے اپنی غذا حاصل کرتا ہے۔" مد وجزر کے موضوع پر ایک مقالہ ہے۔ "چاند اور سورج کے افعال" پر ایک کتاب ہے۔ آسمان اور پورے عالم پر ایک کتاب ہے۔ دو پتھروں کے درمیان آگ کی پیدائش پر ایک مقالہ ہے۔ یونانیوں کے مسلک کے مطابق احکام اعراب پر ایک کتاب ہے۔ فلاسفہ اور حکماء کے نوادرات اور طالب علموں کے آداب پر ایک کتاب ہے۔ کشت کاری پر ایک کتاب ہے۔ قوس وقزح پر ایک مقالہ ہے۔ دنیا اور اس کی آفرینش، انبیا، بادشاہوں، قوموں، مسلمان خلفاء اور شہنشاہوں کی تاریخ پر ایک کتاب ہے۔ فورفوریوس کی کتاب منطق کا ایک مقدمہ ہے۔ فراست کے متعلق ایک کتاب ہے۔ حقیقت ادیان اور مذاہب کی تحقیق پر ایک کتاب ہے۔

اگر ہم ان تمام کتابوں کو گنانے لگیں جو حنین نے ترجمہ کیں یا خود تالیف کیں تو اس طرح ہم اپنے مقصد سے بہت دور جا پڑیں گے۔ اس سے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ حنین اور اس کا اسکول ہی تھا جس نے یونان کے منتخب آثار کو عربی زبان میں منتقل کر دیا تھا۔ اور ان کے شرحیں لکھ کر یا ان کو مختصر کر کے عربوں سے روشناس کرایا تھا۔ ان حضرات نے یونانی ثقافت کو اس کی مختلف شاخوں کے ساتھ مسلمان اور نصرانی علماء کی نگاہوں کے سامنے پیش کیا کہ وہ اس سے برابر استفادہ کرتے رہے۔ ان حضرات اور ان جیسے دوسرے حضرات کی یہ علمی خدمات ہی تھیں جنھوں نے متکلمین اور مسلمان فلاسفہ کو ان کے مذاہب میں خدا ہم پہنچائی۔ جو اس دور میں پروان چڑھے جو اس عہد کے فوراً بعد شروع ہو جاتا ہے۔

حنین نے ترجمہ میں ایک نئی جان ڈال دی تھی کیونکہ انھیں مختلف زبانوں پر عمدہ عبور حاصل تھا چنانچہ علماء اس عظیم فرق کو محسوس کرتے تھے جو حنین کے ترجمہ میں اور ان سے پہلے کے لوگوں کے ترجمہ میں تھا حنین کا ترجمہ نہایت پُر مغز اور دقیق ہوتا تھا جبکہ ان سے پہلے کے ترجمے پھیکے اور بھیکے ہوا کرتے تھے۔ ابن ماسویہ نے جب پہلے پہلے ان کے تراجم کا ایک حصہ پڑھا تو انھوں نے حنین کے ترجمہ کو نہایت پسند کیا اور اعتراف کیا کہ "ایسا نظر آتا ہے کہ ہمارے زمانہ میں مسیح اتر آئے ہیں اور وہ کسی پر وحی فرما رہے ہیں۔" ابن ماسویہ کی جانب سے

سے یہ اس بات کا اعتراف تھا کہ ان کے عہد میں تراجم کی جو شان ہوا کرتی تھی اور جس سے وہ مانوس تھے حنین کا ترجمہ اس سے الگ کوئی خاص چیز تھا۔

اب ہم حنین کے تراجم سے چند نمونے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ بقراط کی کتاب الاسابیع اور جالینوس کی طرف سے اس کی شرح کے شروع میں جس کا ترجمہ حنین نے کیا تھا۔ حنین کہتے ہیں۔

"جالینوس نے کہا کہ بقراط نے انسان کو دنیا سے تشبیہ دی ہے اور اسے "چھوٹی دنیا" کا نام دیا ہے کیونکہ انسان کی تدبیر بھی اسی انداز سے ہوتی ہے جس انداز سے دنیا کی تدبیر کی جاتی ہے۔ یہ کتاب اصحاب قیاس کیلئے ہے یعنی اطباء کی اس نوع کے لئے جو "دغماطیقیین" کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ یہ لوگ مناظرہ اور مباحثہ والے لوگ ہوتے ہیں۔ یہاں بقراط نے طب کے دو جزء بیان کئے ہیں۔ پہلے جزو کا نام "فسیولوغیا" ہے جس میں طبائع کی معرفت اور ان کا اندازہ حاصل کیا جاتا ہے اور جزو دوم کا نام "بطلوغیا" ہے۔ اس میں علل کی معرفت حاصل کی جاتی ہے[۱]"

ایک دوسرے مقام پر کہتے ہیں۔

"بقراط نے کہا: دو فرقدین اس حرارت سے مشابہت رکھتے ہیں جو انسان میں پائی جاتی ہے۔ جالینوس نے کہا تھا کہ اس بلند مرتبہ شخص نے وعدہ کیا تھا کہ وہ دنیا کی سات حصوں میں تقسیم کرے گا۔ چنانچہ اس نے اپنے وعدہ کو پورا کر دیا ہے اور نہایت ہی عمدگی کے ساتھ تقسیم کر دی ہے۔ اس نے عالم اقصیٰ سے شروع کیا ہے اور زمین پر ختم کر دیا ہے۔ اس کے بعد عالم کے ہر ہر جزو کو انسان کے اجزاء پر منطبق کر دیا ہے اور نہایت باریک بینی، حسن تعبیر اور خوبیٔ نظم کے ساتھ یہ کام انجام دیا ہے۔ انھوں نے زمین سے ابتداء کر کے آگ پر ختم کیا ہے۔ ہم ان کے اس قول کی تشریح تو کر چکے ہیں اور وہ وجہ بھی بیان کر چکے ہیں جس کی بناء پر انھوں نے زمین کا ذکر کرنا چاہا ہے اور اسی سے بات کو شروع کیا ہے۔ چونکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ اجزاء انسانی کو اجزاء عالم پر منطبق کریں۔ اور انسان چونکہ ایک زمین کی چیز ہے جو زمین کے اوپر ہی چلتا ہے لہذا زمین ہی سے انھوں نے بات کو شروع کیا اور سب سے پہلے اسی کو بیان کیا ہے۔ اس بیان کو یہاں دوبارہ اس لئے بیان کر دیا ہے تاکہ آپ کو وہ بات یاد آ جائے جو بقراط نے ابھی ابھی کہی تھی کیونکہ کسی مضمون کو جب بار بار بیان کیا جاتا ہے تو وہ دل میں اچھی طرح جاگزیں اور حافظہ میں اچھی طرح محفوظ ہو جاتی ہے[۲]"

---

[۱] کتاب الاسابیع صفحہ ۲ [۲] ایضاً صفحہ ۹۶

تیسرے مقام پر کہتے ہیں۔

"خوب سمجھ لو کہ غصہ عقل کے تابع ہو سکتا ہے۔ جب ہم غصہ سے بیتاب ہو جاتے ہیں تو عقل کو اس غصہ کو کو روکنے اور اس کے ساتھ لگے رہنے کی قدرت و قوت حاصل رہتی ہے وہ غصہ کو اپنا کام کرنے سے روک سکتی ہے۔ کیونکہ غصہ بسا اوقات ناپسندیدہ اور مکروہ افعال کو بھڑکا دیتا ہے۔ لہذا عقل ایسے وقت میں غصہ اور اس کے ان افعال کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔

اور یہ بھی خوب سمجھ لو کہ آفتاب فرقدین گھمانے والا ہے مگر ان کو حرکت دینے والا نہیں ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ آفتاب اوپر جاتا اور نیچے آتا ہے اور اس طرح اپنے اوپر جانے اور نیچے آنے کے بقدر فرقدین کیلئے ظاہر ہوتا رہتا ہے اسی وجہ سے اس فاضل آدمی نے یہ کہا ہے کہ آفتاب فرقدین کی تدبیر کرتا ہے لیکن درحقیقت ان کو حرکت دینے والا نہیں ہے بلکہ ان دونوں کو اس طریقہ پر ظاہر کر دیتا ہے جیسے ہم نے ابھی ابھی بیان کیا ہے۔

ارٰطس شاعر نے بھی اس مضمون کو بیان کیا ہے اور نہایت ہی عمدگی کے ساتھ بیان کیا ہے جو شخص اس مضمون کو اچھی طرح سمجھنا چاہے اسے ارٰطس کی وہ کتاب دیکھنی چاہیئے جو اس نے فلکیات کے موضوع پر لکھی ہے اور اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے[۱]۔

ان تینوں سے ہم یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ حنین کی عبارت مضمون کے اعتبار سے واضح اور اسلوب کے اعتبار سے نہایت عمدہ ہوتی تھی اور ——— جب وہ مجبور ہو جاتے تھے تو ——— علمی اصطلاحات کو اپنے اصل الفاظ ہی میں استعمال کر لیتے تھے مثلاً "دغما طیقیین"، "فیبو لوغیا" اور "ریطلوغیا" اور اس کے بعد ان کے معنی کی تشریح کر دیتے تھے تاآنکہ زبان میں اس لفظ کے لئے کوئی عربی لفظ وضع ہو جاتا۔ وہ متن کو قوسین کے درمیان میں رکھتے ہیں اور اس کے بعد اس کی تشریح جو کچھ کرنی ہوتی ہے کر دیتے ہیں۔ اسی طریقہ کو بعد میں مسلمان علماء بھی اپنی کتابوں میں استعمال کرتے رہے ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ حنین اور ان کا اسکول یونانی ثقافت کے بہترین نمایندے تھے اور ان لوگوں میں ان کا مقام بہت ہی بلند ہے جنھوں نے طبائع کے نسخوں کو عربی پڑھنے والوں کے سامنے پیش کیا ہے۔

---

[۱] کتاب الاسابیع ص۲۴

ثقافتوں کا امتزاج

اس حصہ میں فاضل مصنف نے یہ بتایا ہے کہ مختلف تہذیبوں میں سے کونسی تہذیب سب سے زیادہ اسلام پر اثر انداز ہوئی۔

مذکورہ بالا ثقافتیں، یعنی ایرانی، ہندی، یونانی اور عربی، اور یہودیت، نصرانیت اور اسلام سب کی سب ہمارے اس عہد میں جس کی تاریخ ہم بیان کر رہے ہیں سرزمین عراق پر ایک دوسری سے مل رہی تھیں لیکن ہر ثقافت اپنے ابتدائی دور میں اپنے لئے ایک چھوٹی سی نہر کھودتی تھی جو اسی کے ساتھ مخصوص ہوتی تھی اور اپنے رنگ اور مزے میں دوسری نہروں سے الگ ہوتی تھی۔ پھر کچھ عرصہ تک الگ رہنے کے بعد وہ کسی اور نہر سے مل کر ایک بڑی نہر بن جاتی تھی جس میں مختلف رنگوں اور مزوں کی مختلف العناصر نہریں آ آ کر ملتی جاتی تھیں۔

ہر ثقافت ابتداءً اپنی رفتار پر نظر رکھتی ہے پھر ساری ثقافتیں ایک مقام پر آ کر جمع ہو جاتی ہیں

ان چھوٹی چھوٹی نہروں سے سیراب ہونے میں علماء کا اختلاف

علماء ـــ مختلف الانواع ہونے کی وجہ سے ـــ سب کے سب اس بڑی نہر کے پانی کو خوشگوار نہیں سمجھتے تھے اور نہ اس کا مزہ چکھتے تھے۔ ان میں سے کچھ علماء تو عراق کے دیہات کی طرف نکل جاتے تھے تاکہ عربی نہر کا صاف و شفاف پانی پی سکیں جس میں حضارت و مدنیت کی کدورتیں ابھی شامل نہ ہوئی ہوں۔ انہیں جتنا پانی پینا ہوتا اس عربی نہر سے پیتے اور شہروں کی طرف لوٹتے تو اس خوشگوار پانی کے مشکیزے بھر بھر کر ساتھ لیتے آتے تاکہ یہاں بھی وہی پانی پیتے رہیں۔ کوئی ان سے پانی مانگتا تو انہی مشکیزوں میں سے اسے بھی پلاتے۔ یہ اصمعی جیسے علماء تھے جنہوں نے ـــ مورخین کے قول کے مطابق ـــ اشعار عرب میں سے بارہ ہزار اشعار حفظ کر رکھے تھے اور بے شمار قصیدے اور نوادرات لغت انہیں یاد تھے۔ وہ اسی کے ہو رہے تھے۔ اسی موضوع پر تصنیف و تالیف کرتے، مسجد میں تعلیم دیتے، خلفاء، امراء، رؤساء کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تو اسی کے چرچے کرتے۔ ان کے علاوہ ابو زید انصاری جیسے لوگ بھی تھے جنہیں نوادرات و غرائب لغت کا بڑا عمدہ علم حاصل تھا۔ اور حماد الراویہ، خلف الاحمر، مفضل ضبی، ابو عمرو شیبانی اور محمد بن سلام جمحی وغیرہ حضرات بھی تھے۔ ان حضرات کو صرف عربی نہر ہی پسند تھی، وہیں جاتے اور اسی سے پانی پیتے، عرب کے قبائل میں گھومتے پھرتے، ان کے اشعار، ان کی زبان اور ان کا نثری ذخیرہ نقل کرتے، ان کے نوادرات خواہ وہ کتنے ہی معمولی کیوں نہ ہوں، بیان کرتے، وہاں کی ہر چیز انہیں پسند آتی

تھی، پھر عراق کی طرف واپس آتے اور اُس نہر کے پانی کے گن گاتے اور اس کی شیرینی اور صفائی کی تعریفیں کرتے۔ راستہ میں اگر انھیں کسی دوسری نہر کا پانی ملتا بھی تو اس سے انھیں گھن آتی اور اسے ناپسند کرتے اور ان کی طبیعتیں اسے گوارا ہی نہ کرتیں۔

بعض لوگ ایسے تھے جنھیں صرف یونانی نہر ہی پسند تھی۔ وہ یونانی کتابوں اور یونانی زبان کو سیکھنے اور یونانی تصنیفات سے اپنے دل کو روشن کرتے تھے۔ انھیں کہیں عقل نظر آتی تھی تو انہی کتابوں میں۔ حکمت کی باتیں معلوم ہوتی تھیں تو انہی میں بلکہ وہ سمجھتے تھے کہ حکمت کی باتیں جہاں کہیں بھی ہیں وہ یونان ہی سے مستعار ہیں۔ یہ مثال اس عہد کے سریانی اطبا وغیرہ کی تھی۔

امتزاج کا عمل اور وہ علماء جنہوں نے اسے مدد بہم پہنچائی

کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو دونوں نہروں کا پانی پیتے تھے کبھی اس نہر پر جاتے اور کبھی اُس نہر پر۔ حتیٰ کہ جب دونوں نہروں سے خوب سیر ہو کر پی چکتے تو اپنے برتنوں میں ان دونوں کا پانی بھر کر لے آتے۔ اور عاملوں کر ان دونوں عنصروں کو ملا کر ایک نئی شراب بناتے جسے لوگ بہت خوشگوار سمجھ کر پیتے بہت پسند کرتے اور مزید طلب کرتے تھے۔ ان حضرات کی مثال ابو عبیدہ معمر بن المثنیٰ جیسے حضرات سے دی جا سکتی ہے جو ایرانی غلام تھے۔ انھیں ایرانی آداب، اخبار، علوم، شاہانِ ایران و حکمائے ایران سے پوری پوری واقفیت تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی اخبارِ عرب جاہلی عرب زبان، قصص، حقائق، اور خرافات عرب پر بھی پوری دسترس تھی۔ انھوں نے ایام عرب کو نقل کیا ہے اور مورخین آج تک انھیں نقل کرتے چلے آتے ہیں۔ انھیں دونوں لٹریچروں کی وسیع معلومات حاصل تھیں ـــــ عربی کی بھی اور ایرانی کی بھی ـــــ وہ لوگوں کو درس دینے بیٹھتے کبھی ان کے واقعات سناتے تو کبھی اُن کے واقعات سناتے۔ مفاخرِ عرب اور مفاخرِ ایران میں مقابلہ کرتے۔ اِس پر بھی کتابیں لکھتے اور اُس پر بھی لکھتے۔ فضائل ایران پر کتاب لکھی تو مآثرِ عرب پر بھی کتاب لکھی۔ انھوں نے ایک برتن میں رکھ کر دونوں ثقافتوں کو لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ جن لوگوں میں عربیت کا تعصب تھا انھوں نے ان کو ناپسند کیا۔ انھوں نے دیکھا کہ ان کا پانی صاف نہیں ہے اور نہ اس کا وہ مزہ ہے جس سے سیراب ہونے کے وہ عادی رہے ہیں لیکن جن لوگوں کا رجحان ایرانیوں کی طرف تھا مثلاً موصلی اور ابونواس انھوں نے ایسے آدمیوں کو بہت پسند کیا۔ اسی طرح ان لوگوں نے بھی انھیں پسند کیا جن کا سینہ ہر علم اور ہر خبر کے لئے کھلا ہوتا ہے اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ حکمت کی بات مومن کی کھوئی ہوئی بات ہوتی ہے۔ وہ جہاں بھی مل جائے مومن کو اس کا اعلان کرنا چاہیے مثلاً جاحظ وغیرہ۔

بعض حضرات ایسے بھی تھے جو دو سے زیادہ ثقافتوں اور دو سے زیادہ لٹریچروں سے آراستہ و پیراستہ تھے۔

ان کا بیان آگے آرہا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ عربی نہر سے تو سب لوگ ہی اپنی پیاس بجھاتے تھے۔ اگر ہم سریانیوں کی ایک جماعت کا جو یونانی ثقافت ہی میں لگی تھے یا ان جوسیبوں کا جو ایرانی لٹریچر ہی سے فیضیاب تھے اور زردشتی دین کی پیروی کرتے تھے استثناء کر لیں تو ان کے علاوہ دوسرے لوگ عربی نہر سے کم یا زیادہ اپنا حصہ ضرور حاصل کرتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ سیاسی حکومت اپنے خلفاء، زبان اور دین کے اعتبار سے عربی تھی، لٹریری دولت بھی عربی تھی۔ اس سلطنت میں وہی چیز زندہ رہ سکتی تھی جو عربی ہو۔ اس لئے ہر ادب والا، ہر علم والا، اور ہر زبان والا عربی زبان کو سیکھنے پر مجبور تھا تاکہ وہ عربی زبان میں اپنے افکار، آداب اور علوم کو ڈھال سکے۔ جو لوگ یونانی علوم میں متبحر ہو چکے تھے وہ بھی مجبور تھے کہ جو کچھ انھیں آتا ہے اسے عربی زبان میں منتقل کر دیں۔ جو لوگ فارسی لٹریچر پر عبور رکھتے تھے انھیں بھی اس لٹریچر کو عربی زبان میں ادا کرنا پڑتا تھا۔ کیونکہ اس کے بغیر اس کی کوئی قیمت ہی نہیں تھی۔ اسی طرح ہندوستانی ریاضی داں اور ہندی طبیب کی بھی اس وقت تک کوئی قدر نہیں ہوتی تھی جب تک وہ اپنی معلومات کو عربی زبان کا جامہ نہ پہنا دے۔ اس وجہ سے عربی نہر تمام ادباء اور علماء کا ایک مشترک گھاٹ بن گئی تھی۔ اسی بنا پر کچھ لوگ تو عربی نہر ہی کے ہو رہے اور انھوں نے اسی پر اپنی تمام کوششیں صرف کر ڈالیں۔ انھوں نے اسی میں تبحر حاصل کیا اور اسکے سوا کسی اور نہر کا پانی پیا ہی نہیں۔ کچھ لوگ ایسے نکلے جو دوسری نہروں سے اچھی طرح سیراب ہو چکے تھے لیکن مجبوراً انھیں عربی نہر پر بھی آنا پڑا اور اس کا پانی بھی پینا پڑا تاکہ اس نہر کا پانی ملا کر وہ لوگوں کے لئے اپنی نہروں کے پانی کو خوشگوار بنا سکیں۔

اجنبی ثقافتوں میں سے کونسی ثقافت زیادہ موثر ثابت ہوئی

یہاں ہمارے سامنے ایک سوال آجاتا ہے جس کا جواب دینا ضروری ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ وہ کونسی ثقافت تھی جس کا اثر و نفوذ اور غلبہ زیادہ تھا۔ کیا عربی ثقافت تھی جس کی زبان، ادب اور دین کی حکمرانی تھی۔ یا ایرانی ثقافت تھی جس کے پاس ایک نظم و ضبط اور لٹریچر تھا۔ یا یونانی ثقافت تھی جس کے پاس علم اور فلسفہ تھا؟ آپ چاہیں تو اس سوال کو ان الفاظ میں ادا کر سکتے ہیں کہ عربی ثقافت پر کونسی ثقافت زیادہ اثر انداز ہوئی تھی۔ ایرانی ثقافت یا یونانی ثقافت؟ یہ واقعہ ہے کہ دونوں ثقافتوں نے ہی عربی ثقافت کو اپنے رنگ میں رنگا ہے۔ اگر یہ دونوں ثقافتیں نہ ہوتیں تو عربی ثقافت کا آج وہ رنگ نہ ہوتا جو ہم دیکھ رہے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ان میں سے کس کا رنگ روشن اور تیز تھا اور کس کا رنگ ہلکا اور کمزور تھا؟

نفوذ کے دائرے

یہ سوال بڑا دشوار ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اس سوال کا جواب مطلق انداز سے نہیں دینا چاہیئے۔ ہمیں یہ کہنا چاہیئے کہ ان ثقافتوں میں سے ہر ثقافت کا منطقۂ نفوذ الگ الگ تھا جس میں کوئی دوسری ثقافت اس کی مزاحم نہیں تھی۔ چنانچہ علوم ریاضیہ مثلاً حساب، جبر ہندسہ، فلکیات، طب، ومتعلقات طب اور فلسفہ وغیرہ تو یونانی منطقۂ نفوذ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں اس کی مزاحم ہندی ثقافت تھی لیکن اس کی مزاحمت کچھ زیادہ شدید نہیں تھی۔ مسلمانوں میں ان تمام علوم کی بنیاد عموماً یونانی بنیاد ہی ہے ـــــ اگرچہ اس کے بعض ارکان ہندی ضرور ہیں ـــــ ان علوم میں جو انداز تحریر اختیار کیا گیا ہے وہ اپنے منطقی انداز اور طرز تالیف میں یونانی ہی ہے۔ یہی حال ان شروح کا ہے جو ان فنون کی کتابوں پر لکھی گئی ہیں۔ ان علوم کی کتابوں کی ایک خاص چھاپ ہے جو ادبی کتابوں کی چھاپ سے مختلف ہے۔ نیز جغرافیہ اور تاریخ کی کتابوں کی چھاپ سے بھی مختلف ہے ان پر خالص یونانی چھاپ لگی ہوئی ہے کیونکہ یہ کتابیں پوری طرح یونان تراجم سے متاثر ہوئی ہیں جو یونانی زبان سے عربی میں ترجمہ ہوئی ہیں۔ ان کی شکل وصورت بھی برابر محفوظ رہی حتیٰ کہ جب خود مسلمانوں نے ان علوم پر کتابیں لکھیں تو اس وقت تک بھی یہ اثر باقی رہا۔ ہندی ریاضیات اور ہندی فلکیات کا اثر بھی ان علوم پر مسلمانوں کی تصنیفات میں شروع ہوا تھا۔ لیکن وہ باقی نہیں رہ سکا اور جلد ہی ختم ہوگیا۔

رہ گیا ادب تو وہ یونانی ادب سے کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوا۔ یہ ان کتابوں کے مطالعہ سے نظر آسکتا ہے جو اس عہد میں تصنیف کی گئیں۔ ان کا انداز تحریر عجیب وغریب ہے جو کسی طرح بھی یونانی انداز تحریر سے لگا نہیں کھاتا۔ نہ منطقی ترتیب کا ان میں کوئی نشان ہے۔ نہ کسی کتاب یا باب کی کوئی ایک وحدت ہے۔ جیسا کہ ہم میرد کی الکامل میں دیکھ چکے ہیں یا جاحظ کی البیان والتبیین میں دیکھ سکتے ہیں۔ بہت سی جزئیات ہیں جو بلا لحاظ موضوع یونہی کیفما اتفق جمع کر دی گئی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی مجلس میں بہت سے علماء جمع ہیں اور وہ آپس میں قصہ گوئی کر رہے ہیں۔ ایک موضوع مقرر کرنا اور جو باتیں بیان کرنی ہوں انھیں ترتیب وار بیان کرتے جانا۔ جن میں انکار کا تسلسل باقی رہے اور درجہ بدرجہ الف سے لیکر یا تک آپ کو پہنچا دے جیسا کہ منطق یونانی کا انداز ہے تو اس قسم کی کوئی بات ہمیں عربی لٹریچر کی کتابوں میں نہیں ملتی۔

یہ کچھ تو ظاہری شکل وصورت کے اعتبار سے تھا۔ رہ گیا موضوع کے اعتبار سے تو واقعہ یہی ہے کہ عربی ادب میں جتنا کچھ مشرقی، ایرانی یا ہندی آداب کا اثر ملتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو یونانی اثرات سے ملتا ہے۔ عربی لٹریچر میں اردشیر اور نوشیروان کی حکم افلاطون اور ارسطو کی حکم کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہیں۔ نظام حکومت، بجائے یونانی نظام حکومت کے خالص ایرانی ہے۔ اس میں عدل کا وہی تصور ہے اور لوگوں کے طبقات کا وہی تصور ہے جو ایرانیوں کے ہاں پایا جاتا تھا۔ اس میں بادشاہوں کی توقیعات (درخواستوں پر تحریری احکام) اور رعایا کے ساتھ ان کے قصے اسی

انداز کے ہیں جو ایرانیوں کے ہاں ہوتے تھے نہ کہ یونانی انداز کے۔ مختصر یہ ہے کہ ادب میں ایرانیوں کا اثر و نفوذ بہ نسبت یونانیوں کے کہیں زیادہ ہے۔ اس کی وجہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

یہ بات ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ اس عہد میں ادب کے علمبردار شعراء اور منشی وغیرہ ایرانی الاصل ہی تھے۔ دونوں ماں باپ کی طرف سے یا کم از کم ایک طرف سے۔ اس کے بعد انھوں نے عربی زبان سیکھی اور اس میں مہارت حاصل کر لی۔ لہٰذا انھوں نے عربی ادب کی جو تجدید کی وہ ایران اور عرب دونوں ہی سے اثر پذیر تھی۔ انھوں نے عربی ادب میں نئے عناصر داخل کئے جو اس میں پہلے نہیں تھے۔ چنانچہ بشار فارسی ایسی نئی تشبیہات اختراع کرتا ہے جو عربوں نے استعمال نہیں کی تھیں۔ ابو العتاہیہ جو دینی شعر گوئی کا نمائندہ اور اس کا پیشرو ہے۔ وہ بھی موالی میں سے ہے۔ ابو نواس جو خمریات اور متعلقات خمر میں خاص شہرت رکھتا ہے اور جس نے ہجو گوئی کا وہ دروازہ کھولا جس سے عرب کے لوگ واقف ہی نہیں تھے، آدھا ایرانی ہے۔ یہی حال منشیوں اور ان کے اسلوب تحریر کا تھا جو انھوں نے عربی لٹریچر میں داخل کیا۔ مثلاً ابن المقفع اور سہل بن ہارون وغیرہ یہ سب کے سب ایرانی اصل سے تعلق رکھتے تھے یا ایرانی اصل کے قریب قریب کی اصل سے۔ جو کچھ لٹریچر انھوں نے پیدا کیا وہ ـــــ بلاشبہ ـــــ ایرانی اصل اور عربی ثقافت دونوں کی پیداوار تھا اور اس حیاتِ اجتماعی سے رنگا ہوا تھا جو اس وقت عراق میں رواج پذیر تھی۔ ان ادیبوں میں بہت کم کوئی ادیب رومی الاصل ہوا ہوگا جو رومی رنگ میں رنگا ہوا اور رومی ثقافت سے آراستہ ہو۔ چونکہ عباسی عہد کا ادب، ادبی بنیادوں میں سے ایک بڑی بنیاد تھی جس کے انداز پر بعد میں آنے والے ادیب چلے اور جس کی پیروی وہ کرتے رہے اور چونکہ اس بنیاد میں عربوں کے شریک ایرانی رہے تھے نہ کہ یونانی۔ اس لئے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ادب میں یونانیوں کا اثر بہت ہی کمزور تھا۔

پھر یہ کہنا بھی ایک حقیقت واقعہ کا اظہار ہے کہ عربی ادب میں عربوں کا نفوذ ـــــ خصوصیت کے ساتھ عربی اشعار میں ـــــ کسی دوسری اثر و نفوذ سے زیادہ قوی تھا۔ عربی شعر ہمارے موجودہ زمانہ تک بھی اپنے جاہلی اوزان اور تقلیدات کو محفوظ لئے چلا آتا ہے۔ کوئی قوم خواہ وہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو اپنے اثر و نفوذ سے اس میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکی۔ ہم نے جو کچھ یونانی اثرات کے متعلق عرض کیا ہے وہ بھی بعض عناصر ہی میں تھا ـــــ یعنی ان عناصر میں جو شعر کے قالب میں ڈھالے جاتے ہیں ـــــ خود نفس قالب میں نہیں تھا۔ ابو نواس جاہلی شعراء پر پھبتیاں کستے ہوئے کہتا ہے۔

صِفَةُ الطُّلُولِ بَلَاغَةُ الْقِدَمِ
فَاجْعَلْ صِفَاتِكَ لِابْنَةِ الْكَرْمِ

(ٹیلوں کے اوصاف بیان کرنا پرانے لوگوں کی بلاغت تھی۔ تو اپنے اوصاف شراب کے لئے مخصوص کرے)
لیکن وہ ــــ اسکے باوجود ــــ اس کی قدرت نہیں رکھتا کہ عربی شعر کی قیود سے اپنے آپ کو آزاد کرے۔ اگر وہ ایسا کرتا تو اس کے اشعار نہ کوئی پڑھتا نہ کوئی سنتا۔ امام حافظ ــــ اپنے عہد میں ــــ جاہلی شعر اور جاہلی ورثہ کی طرف لوگوں کا رجحان بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں "لوگ جاہلی اشعار کو اسلامی اشعار پر برتری دیتے ہیں۔ وہ اس کے بہت زیادہ فریفتہ ہیں اور اس کی بڑی ہی قدر کرتے ہیں" اور فرماتے ہیں کہ "لوگ حاتم کو عرب کا سب سے بڑا سخی شمار کرتے ہیں۔ اگر رائے کے صحیح اندازہ پر یہ معاملہ موقوف ہوتا تو غالب بن صعصعہ کو سخاوت کے ساتھ مشہور تر لوگوں میں سے ہونا چاہیئے تھا نہ کہ ہرم اور حاتم کو۔ لیکن اگر آپ اسے دیکھتے ہوئے یوں کہدیں کہ غالب بن صعصعہ ایک اسلامی آدمی تھے اور حاتم کا تعلق زمانہ جاہلیت سے تھا اور لوگ زمانہ جاہلیت سے متعلق مآثر عرب کے زیادہ فریفتہ اور قدردان ہیں تو آپ کا یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا" اور فرماتے ہیں "عربوں کے دلوں میں اسلام کے زمانہ اور اس زمانہ کے لوگوں کی وہ عظمت اور ذہنوں میں وہ قدر نہیں ہے جو زمانہ جاہلیت کے لوگوں کی ہے باوجودیکہ دونوں کا زمانہ قریب قریب ہی ہے اور باوجودیکہ اسلام ہی وہ طاقت ہے جو تمام عربوں کے لئے وجہ جامع بن سکتا ہے اور خدا نے بھی اسے ان کی رشتہ داریوں سے زیادہ قریب تر قرار دیا ہے"[1]۔ ان تمام باتوں نے اسلامی لٹریچر میں جاہلی لٹریچر کی تاثیر کو شدید اور قوی بنا دیا تھا۔ اور مسلمانوں کو جاہلی ادب کی پیروی ہی کرنی پڑتی تھی اور وہ ــــ زیادہ تر ــــ اس کی قیود اور پابندیوں سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ علوم و فنون میں اجنبی ثقافتوں کے اثرات کتنے ہی نمایاں کیوں نہ ہوں لیکن لٹریچر ان کے اثرات بہت ہی خفیف تھے۔ اگر یہ اثرات ذرا بھی قوی اور شدید ہوتے تو وہ ضرور جاہلی اشعار کی بحروں پر فارسی یا یونانی بحروں کا اضافہ کر لیتے۔ اور کبھی تو قافیہ کی پابندیوں سے اپنے آپ کو آزاد کرنے کی کوشش کرتے۔ اور تمثیلی اور قصصی اشعار کی اقسام کو اپنے ہاں داخل کر لیتے اور قصیدہ گوئی کے پرانے انداز کی جگہ کوئی نیا انداز اختیار کرتے ــــ وہ ٹیلوں پر کھڑے ہو کر رونے اور آبادیوں پر آنسو بہانے کی پابندیاں اٹھا دیتے اور ممدوح کی مدح کرنے سے پہلے طویل و عریض غزلیں کہنے کو خیرباد کہتے اور اس قسم کی اور بہت سی باتیں کر گزرتے اور شعر و ادب میں ایک انقلاب برپا ہو گیا ہوتا اور جیسا کہ علوم و فنون میں ہوا تھا اسی طرح ادب بھی ایک نئے انقلاب سے آشنا ہو گیا ہوتا۔ البتہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کچھ تبدیلیاں ضرور ہوئیں مثلاً بعض شعری فنون ادب میں داخل ہو گئے اور حیاتِ اجتماعی کے رنگ میں وہ رنگے گئے وغیرذلک لیکن یہ تبدیلیاں کچھ اہمیت نہیں رکھتیں۔ یہ بڑی ہی

---

[1] حیوان ص۳۷ جلد ۱

خفیف تبدیلیاں ہیں جو وضاحت و صراحت کے ساتھ بتلانے کے بعد ہی نظر آسکتی ہیں۔ زمانہ جاہلیت کی عربی طب اور حنین ابن اسحاق اور نجیشوع کی طب میں کتنا بڑا فرق تھا۔ بارش لانے والے ستاروں اور دیگر نجوم کی طرف ایک عربی آدمی کی نظر اور نوبخت کی نظر میں کتنا نمایاں فرق تھا۔ بلکہ فقہ کے متعلق جو کچھ عبداللہ بن مسعودؓ سے نقل کیا جاتا ہے اور جو کچھ محمد بن الحسنؒ سے نقل کیا جاتا ہے ان دونوں میں کتنا عظیم فرق تھا اور ابوالاسود دؤلی کی نحو میں ——— جیسا کہ لوگ نقل کرتے ہیں ——— اور سیبویہ کی نحو میں کتنا شدید فرق تھا لیکن آپ یہ وسیع مسافتیں جاہلی اشعار اور اسلامی و عباسی اشعار کے درمیان نہیں پائیں گے۔

مختصر یہ کہ اثر اندازی کے گوشے، اس کے سرچشمے اور اس کی مقدار مختلف تھی اور یہ اختلاف معمولی نہیں تھا۔ آپ کتنی ہی باریک بینی سے اس کا اندازہ لگائیں صحیح اندازہ تک آپ نہیں پہنچ سکتے۔ اگر آپ چاہیں کہ اس اثر اندازی کو آپ اعداد میں تعبیر کر دیں تو یقیناً آپ کے قویٰ آپ سے خیانت کر جائیں گے اور اس کی راہ آپ نہیں پا سکیں گے۔ ہم زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ یونانی ثقافت کی طبیعت عقلی اور منطقی تھی۔ وہ ہر بات کے لئے مقدمات اور نتائج قائم کرنا چاہتی تھی۔ ثقافت کی یہ نوعیت مسلمانوں میں ریاضیات اور فلسفہ اور ان کے متعلقات میں جلوہ گر ہوئی۔ یہ چیزیں (ریاضیات اور فلسفہ وغیرہ) عہد عباسی میں مسلمانوں تک پہنچیں۔ ان کی جگہ ——— تقریباً ——— خالی ہی تھی۔ لہٰذا وہ بغیر کسی مزاحمت کے یونانی رنگ میں آسانی کے ساتھ رنگی گئیں۔ ایرانی ثقافت کی طبیعت ——— جو کچھ ہم تک پہنچی ہے ——— عملی فلسفہ کی نوعیت رکھتی ہے۔ ان کے ہاں کچھ حکم ہیں جو عدل، ظلم اور نظام حکومت کے متعلق ڈھالی گئی ہیں۔ اور اسی قسم کی رقیق غور و فکر سے قائم کئے ہوئے نظریات کا کوئی بڑا اثر نہیں ہوتا جیسا کہ یونانیوں کے ہاں ہوتا ہے۔ وہ تو عملی تجربات ہیں جو تجربہ میں آئے اور حکمت یا ضرب المثل کے قالب میں ڈھال لئے گئے۔ اس قسم کی چیزیں عربی ادب کے لئے خوشگوار ہو سکتی تھیں کیونکہ ان کے ہاں بھی خود اسی قسم کی ضرب الامثال ہوا کرتی تھیں، ہندی ثقافت کی طبیعت، حکمت اور فلسفیانہ اور ریاضیاتی نظریات کا آمیختہ تھی۔ حکمت کا انداز تو وہی تھا جو ایرانی حکمت کے متعلق ہم نے بیان کیا ہے۔ یہ انداز کلیلہ و دمنہ جیسی کتابوں میں جلوہ گر ہے۔ جہاں تک فلسفیانہ اور ریاضیاتی نظریات کا تعلق ہے وہ کسی قدر یونانی انداز سے شباہت رکھتا ہے۔ لیکن البیرونی نے یہ بات محسوس کی ہے کہ ہندی فلاسفہ اس عمدگی کے ساتھ نہ علت بیان کرتے ہیں اور نہ دلائل قائم کرتے ہیں جیسا کہ یونانی کرتے ہیں۔ عربی ثقافت کی طبیعت ادبی اور انسانی ہے۔ اس میں سب سے زیادہ نمایاں چیز اس کا فنی جمال ہوتا ہے۔ وہ بدیہہ گوئی، سلیقہ اور فطرت کی پیداوار ہوتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جاحظ کو یہ کہنا پڑا ہے کہ "ہندوستانی کتابیں عربی میں منتقل ہوئیں۔ یونان کی حکم کا عربی میں ترجمہ ہوا۔ ایرانی آداب کو عربی زبان میں ڈھالا گیا۔ تو بعض چیزوں کا حسن تو پہلے سے بڑھ گیا اور بعض چیزوں کے حسن میں کوئی

کمی نہیں آئی۔ اگر کہیں عربی حکمت کو کسی دوسری زبان میں تبدیل کیا گیا ہوتا تو اس کا وہ اعجاز جسے وزن کہا جاتا ہے ختم ہو گیا ہوتا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ اگر وہ انہیں دوسری زبان میں تبدیل کرتے تو ان کے مضامین میں کوئی نئی بات انہیں نہ ملتی جنہیں اہل عجم نے اپنی کتابوں میں بیان نہ کیا ہو خواہ وہ کتابیں ان کی معاشیات سے تعلق رکھتی ہوں یا ان کی حکمتوں اور عقلی نکتوں سے[1]۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ترجمہ کرنے میں محدود معانی کو بیان کر دینا تو بہت ہی آسان ہے۔ سب سے زیادہ مشکل اسلوب بیان کی خوبصورتی ہوتی ہے۔ اب عربی کی طبیعت چونکہ وہ تھی جو ہم نے ابھی بیان کی ہے لہٰذا اس کی چیزوں کو دوسری زبانوں میں منتقل کرنا بہت ہی دشوار ہے۔ اگر ان باتوں کو کسی دوسری زبان میں بیان کیا جائے تو اس کی خوشنمائی ختم ہو جاتی ہے اور اس کی خوبصورتی ضائع ہو جاتی ہے۔

ان مختلف طبائع کے نتائج فکر کو پھیلانے میں مختلف قوموں نے کام کیا تھا۔ عباسی وزراء اور ان کے طبقہ کے دوسرے لوگ ایرانی ثقافت کے مؤید تھے۔ جندیساپور کا اسکول اور اس کی شاخیں یونانی ثقافت کی مؤید تھیں۔ عرب کے لوگ ادیب، علماء لغت و نحو، عربی ثقافت کے مؤید تھے۔ ہندوستانی اطباء، ہندی ثقافت کا مؤید تھے۔ ان سب نے مل کر ان مختلف ثقافتوں کو فضا میں بکھیر دیا تھا۔ ان میں سے ہر گروہ اپنے میلانات، استعداد اور انواع تعلیم کے مطابق سانس لیتا تھا۔ وزراء اور منشی حضرات پر ایرانی اور عربی ثقافت غالب تھی۔ محلات شاہی کے طبیب نسطوری فرقہ کے لوگ تھے جن پر یونانی اور عربی ثقافت کا غلبہ تھا۔ اور متکلمین —— لیکن ظاہر ایسا ہی نظر آتا ہے —— ہر نوع کی ثقافت میں حصہ دار اور شریک تھے۔ جاحظ فرماتے ہیں کہ متکلمین ہر چیز کو جان لینا چاہتے ہیں مگر خدا کو ان کی یہ بات منظور نہیں ہے[2]۔ واقعہ یہی ہے کہ مختلف ثقافتوں کے امتزاج و اختلاط میں مختلف گوشوں سے متکلمین نے بہت بڑا کام انجام دیا تھا۔ ان کے اس موقف کا جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں یعنی لوگوں کو اسلام کی دعوت دینا یہ فطری تقاضا تھا کیونکہ وہ دوسرے ادیان یعنی مجوسیت، یہودیت اور نصرانیت سے پوری پوری واقفیت بہم پہنچانے پر مجبور تھے۔ یہودیت اور نصرانیت چونکہ یونانی فلسفہ اور یونانی منطق سے مسلح تھی لہٰذا متکلمین کو بھی ان ہی کے ہتھیاروں سے مسلح ہونا پڑا۔ چنانچہ متکلمین ہی پہلے لوگ تھے جنہوں نے اسلام میں فلسفہ کو داخل کیا۔ یہ متکلمین ہی پچھلے مسلمانوں کے درمیان جو قرآن و حدیث کی نصوص سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ اور بعد میں آنے والے مسلمان فلاسفہ مثلاً فارابی، ابن سینا اور ابن رشد کے درمیان حلقۂ اتصال تھے۔ چونکہ ان کا موقف نیا تھا اور وہ سلف کے طریقہ سے الگ ہو کر جا رہے تھے اس لئے ان لوگوں نے بہت سے ایسے مسائل سے بھی تعرض کیا جن سے پچھلے لوگ تعرض نہیں کرتے تھے لہٰذا ان کے مقابلہ میں مخالفین کا ایک طبقہ کھڑا ہو گیا جن کے آگے

---

[1] الحیوان صفحہ ۳ جلد ۱ [2] الحیوان صفحہ ۱۰۰ جلد ۳

آگے علماء حدیث تھے اور دونوں فریقوں میں ایک شاندار جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ کی تفصیلات ہم متکلمین پر گفتگو کرتے ہوئے انشاء اللہ آئندہ نقل کریں گے۔

متکلمین حضرات ہی یونانی فلسفہ اور عربی ادب کے درمیان بھی ایک نقطۂ اتصال تھے ——— جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ——— یہ حضرات یونانی ثقافت سے آراستہ و پیراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ عربی ثقافت یعنی لغت اور ادب سے بھی وافر حصہ رکھتے تھے۔ ان حضرات نے ان دونوں کو مکمل طور پر ملا دیا تھا۔ ان کے سامنے جو یونانی معانی و مضامین آتے یونانی نام آتے تھے۔ وہ ان کے لئے عربی الفاظ وضع کرتے تھے۔ چونکہ وہ ——— اسلام کی طرف دعوت دینے میں ——— اس پر مجبور تھے کہ اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کے لئے بہترین الفاظ اور بہترین تعبیرات کا انتخاب کریں لہٰذا وہ خطابت و بلاغت کے مشاق بن گئے تھے۔ انھوں نے خطابت و بلاغت کی بنیادیں بھی اسی طرح قائم کیں جس طرح بحث و مناظرہ کے آداب کی بنیادیں قائم کی تھیں۔ حافظ فرماتے ہیں متکلمین کے سربرآوردہ حضرات اور مناظرین کے آئمہ اکثر بلند پایہ خطیبوں سے بلند مرتبہ اور اکثر بلغاء عرب سے بلیغ تر واقع ہوئے تھے۔ انھوں نے ہی ان الفاظ کو ان معانی کے لئے منتخب کیا تھا۔ انھوں نے ہی کلام عرب سے ان اسماء کو مشتق کیا تھا اور جن چیزوں کا عربی زبان میں کوئی نام نہیں تھا انھوں نے ہی ان کے اصطلاحی نام وضع کئے تھے۔ لہٰذا اس خصوصیت میں وہ تمام بعد میں آنیوالوں کے لئے سلف کا درجہ رکھتے تھے اور ہر پیچھے چلنے والے کے لئے امام اور پیشوا تھے چنانچہ انھوں نے ہی عرض، جوہر، این اور لیس جیسی اصطلاحات بولیں اور مطلان اور تلاشی میں فرق کیا اور ہویۃ، ہویۃ اور ماہیۃ اور ان جیسے الفاظ کا ذکر کیا۔

انھوں نے ادباء اور شعراء کے سامنے ایسے مضامین و معانی پیش کئے جو اب سے پہلے معروف نہیں تھے اور انھوں نے ایسی تعبیرات مہیا کیں جو اب سے پہلے موجود ہی نہیں تھیں۔

(اس کے بعد فاضل مصنف نے مختلف شعراء کے اشعار درج کئے ہیں جنھیں ہم بہ خوف طوالت حذف کرتے ہیں)

مختصر یہ ہے کہ متکلمین مختلف چیزوں کے درمیان نقطۂ اتصال تھے۔ وہ مختلف ادیان کے درمیان نقطۂ اتصال تھے تو ساتھ ہی دین اور فلسفہ کے درمیان بھی نقطۂ اتصال تھے۔ لہٰذا اگر ہم یہ کہیں کہ عمل امتزاج و اختلاط کو قائم کرنے میں وہ نمایاں حیثیت رکھتے تھے تو ہم صداقت سے دور نہیں جائیں گے!

اگر متکلمین یونان اور مسلمانوں کے درمیان نقطۂ اتصال تھے تو ایران کے وہ لوگ جو عربی ثقافت میں رنگے گئے تھے ایرانیوں اور عربوں کے درمیان نقطۂ اتصال تھے۔ انھوں نے ایرانی لٹریچر کو جس میں وہ پیدا ہوئے تھے عربی لٹریچر

کے ساتھ آمیز کیا جسے انھوں نے تعلیم کے ذریعہ سے حاصل کیا تھا۔ انھوں نے ایرانی قصوں کہانیوں کو عربی قصوں کہانیوں کے ساتھ ملایا جیسا کہ "الف لیلہ و لیلہ" وغیرہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے ایرانی حکم و تشبیہات کو عربی حکم و تشبیہات کے ساتھ آمیز کیا۔ کسریٰ نوشیرواں کے متعلق مشہور تھا کہ اسے نرگس کا پھول بہت زیادہ پسند تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ نرگس تو زرد رنگ کا ایک یاقوت ہے جو سفید موتی کے درمیان سبز رنگ کے زمرد پر چڑھا ہوا ہے۔ عربی شعر نے اس تشبیہ کو یوں ادا کیا ہے۔

وَیَاقُوْتَةٍ صَفْرَاءَ فِی رَأْسِ دُرَّةٍ — مُرَکَّبَةٍ فِی قَائِمٍ مِنْ زَبَرْجَدِ
کَأَنَّ بَقَایَا الطَّلِّ فِی جَنَبَاتِهَا — بَقِیَّةُ دَمْعٍ فَوْقَ خَدٍّ مُوَرَّدِ

بعض زرد رنگ کے یاقوت، زبرجد کی تختی میں جڑے ہوئے ایک موتی کے سرے پر لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کے پہلوؤں میں بقیہ شبنم یوں معلوم ہوتی ہے جیسے گلاب گوں رخساروں پر بچے کھچے آنسو ہوں۔

اردشیر بن بابک گلاب کی تعریف میں کہا کرتا تھا۔ وہ ایک سفید موتی اور سرخ یاقوت ہے جو سبز رنگ کے زبرجد کی کرسی پر رکھا ہوا ہے اور اس کے درمیان میں زرد رنگ کے خالص سونے کا زیرہ چھڑکا ہوا ہے۔ اس میں شراب کی رقت اور عطر کی لپٹیں ہیں۔ اس مضمون کو محمد بن عبداللہ ابن طاہر یوں کہتے ہیں۔

کَأَنَّهُنَّ یَوَاقِیْتٌ یُطِیْفُ بِهَا — زُمُرُّدٌ وَسْطَهُ شَذْرٌ مِنَ الذَّهَبِ
فَاشْرَبْ عَلَی مَنْظَرٍ مُسْتَطْرَفٍ حَسَنٍ — مِنْ خَمْرَةٍ مُزَّةٍ کَالْجَمْرِ فِی اللَّهَبِ

گویا کہ وہ یاقوت کے ٹکڑے ہیں جنھیں چاروں طرف سے زمرد نے گھیرے میں لے رکھا ہے اور ان کے وسط میں سونے کا زیرہ چھڑکا ہوا ہے۔ اس حسین اور خوش کن منظر میں سرخ شراب پیو ایسی شراب جیسے آگ کے شعلوں میں آگ کا انگارہ ہوتا ہے۔

ایران کے لوگ خرافات گھڑتے تھے تو عرب کے لوگ بھی اس انداز پر چلتے تھے۔ چنانچہ "عنقا" کے بارہ میں عربوں نے جو کچھ کہا ہے وہ ان خرافات سے قریبی مشابہت رکھتا ہے جو ایرانیوں نے "سیمرغ" کے بارہ میں کہی ہیں۔ ایرانیوں کی ان خرافات میں سے ایک خرافات یہ بھی تھی کہ وہ کہتے تھے کہ سیمرغ کا مسکن ایک درخت کے اوپر ہے جو تمام حبوب (تخم) کو محفوظ رکھتا ہے۔ یہ درخت ایک وسیع سمندر میں واقع ہے جو شجرۃ الخلد سے بہت قریب ہے اس درخت پر وہ تمام بیج جمع ہو جاتے ہیں جنھیں دنیا کے تمام درختوں نے سال بھر کے عرصہ میں پیدا کیا ہوتا ہے۔[لہ]

لہ ملاحظہ ہو شاہنامہ اور اس کا حاشیہ صفحہ ۵۹

یہ خرافات عربوں میں نقل ہوتی رہیں حتیٰ کہ فیروزآبادی نے اسے اپنی مشہور لغت کی کتاب "القاموس المحیط" میں داخل کر دیا چنانچہ وہ فرماتے ہیں: "جزائر خالدات جنہیں جزائر سعادت بھی کہا جاتا ہے چھ جزیرے ہیں جو بحر محیط میں مغربی جانب واقع ہیں۔ انہی جزائر سے علمائے نجوم شہروں کا طول بلد نکالنا شروع کرتے ہیں۔ ان جزیروں میں مشرق و مغرب کے تمام میوے پھل اور پھول اور گلاب اور ہر قسم کے غلے بغیر بوئے اور لگائے از خود پیدا ہو جاتے ہیں[1]۔ اگر کوئی پڑھنے والا شاہنامہ اور اس کی خرافات کا مطالعہ کرے تو وہ ان کے درمیان اور عربوں کی مشہور خرافات کے درمیان بے اندازہ مشابہت اور یکسانیت محسوس کرے گا: مثلاً "اژدھاک" کی خرافات کو لے لیجئے۔ یہ آریائی خرافات میں ایک شریر روح ہے۔ اور "اپتاق" کو لے لیجئے جو ایک ایسا شیطان ہے جو بادلوں کے پانی کو زمین تک پہنچنے سے روکتا ہے۔ ایرانیوں کے نزدیک وہ ایک ظالم و جبار فرشتہ ہے جس میں تمام برائیاں منتقل ہو گئی ہیں۔

عربی میں یہ بات "ضحاک" کی طرف پلٹ جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ضحاک یمن کا ایک عربی نژاد شخص تھا۔ ابو نواس اپنے اس قصیدہ میں جس میں وہ نزاریوں کے خلاف قحطان پر فخر کرتا ہے ضحاک پر فخر کرتا ہوا کہتا ہے۔

وَكَانَ مِنَّا الضَّحَّاكُ يَعْبُدُهُ الْجِنَّا　　　بِلُ وَالطَّيْرُ فِي مَسَارِبِهَا

(اور ضحاک ہم میں سے تھا جس کی جنات اور پرندے اپنے آشیانوں میں پرستش کیا کرتے تھے)

صاحب قاموس فرماتے ہیں کہ ضحاک ایک آدمی تھا جو سرزمین ایران کا بادشاہ بن گیا تھا۔ اس کی ماں ایک جنی عورت تھی چنانچہ وہ جنات ہی میں چلا گیا۔ الخ

ہندوستان سے تناسخ ارواح کا مذہب منتقل ہو کر عراق میں پھیلتا ہے اور غالی شیعہ اور بابک خرمی اور اس کے اصحاب اس کے داعی بن جاتے ہیں۔

عراق میں اس طرح یہ تمام ثقافتیں مختلط ہوتی رہیں۔ اور افکار و آراء کا تبادلہ ہوتا رہا۔ اسی طرح آداب ایک دوسرے سے متاثر ہوتے رہے۔ اغانی کا بیان ہے کہ "بصرہ کی مسجد میں کچھ لوگوں کا ایک حلقہ تھا۔ یہ لوگ مناظرے کیا کرتے تھے اور اپنی گفتگوؤں اور رد و قدح کے دوران مسجد میں بہت شور مچایا کرتے تھے۔" اس کے پہلو بہ پہلو اور بھی بہت سے حلقے تھے۔ ایک حلقہ شعر و ادب کا تھا اور باقی حلقے دیگر علوم و آداب کے تھے۔ ان حلقوں میں جو لوگ شریک ہوتے تھے وہ مختلف جنسوں، مختلف مذہبوں اور مختلف افکار و آراء سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ لوگ مسجد میں ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ ایک دوسرے سے دلیل بازیاں اور بحث مباحثے کرتے تھے۔ حافظ ایک روز صبح سویرے حدیث پڑھنے کے لئے مسجد کی طرف

---

[1] القاموس مادہ جلد ش س

روانہ ہوئے۔ راستہ میں حنین بن اسحاق اور سلمویہ سے ملاقات ہوگئی۔ آگے چلے تو ایک نصرانی اور یہودی مل گیا اور جاحظ نے ان دونوں سے مناظرہ شروع کر دیا۔ وہاں سے فارغ ہو کر آگے چلے تو ایک عربی بدو مل گیا۔ اس سے زبان و لغت کے متعلق معلومات حاصل کرنی شروع کر دیں۔ مختصر یہ کہ مختلف ادیان کے لوگ ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے تھے اور ہر دین کا پیروکار دنیا کی پیدائش کے متعلق جو کچھ اس کی کتابوں میں آیا تھا اسے بیان کرتا تھا۔ ربوبیت باری کے متعلق مناظرے ہوتے تھے کہ وہ ہوگی یا نہیں ہوگی؟ صفاتِ خداوندی کے متعلق جھگڑے ہوتے تھے کہ وہ ذاتِ خداوندی پر زائد ہیں یا نہیں ہیں؟ جبکہ دوسرے لوگ اس سلسلہ میں جھگڑتے تھے کہ کونسی قوم بہتر ہے۔ یہ عربوں کی تائید کر رہا ہے تو وہ غیر عربوں کی تائید کر رہا ہے۔ کچھ اور لوگ زبان اور لٹریچر کے سلسلہ میں جھگڑ رہے ہیں اور علماء مختلف زبانوں اور مختلف لٹریچروں میں موازنے کر رہے ہیں۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے ایک شدید قسم کی تحریک شروع ہوگئی تھی جس نے کسی دین، مذہب، زبان اور لٹریچر کو نہیں چھوڑا تاکہ وہ الگ تھلگ رہ کر زندگی بسر کر سکے۔ اس نے کوئی جزو نہیں چھوڑا تھا جسے دوسرے اجزاء کے ساتھ خلط ملط نہ کر دیا ہو۔ حتیٰ کہ تحقیق کرنے والے کے لئے یہ بہت ہی مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ ان چیزوں کی اصل کا پتہ لگا سکے۔ یہ اختلاط و امتزاج کچھ اس قسم کا نہیں تھا جیسے تیل اور پانی ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں کہ ہر عنصر دوسرے عنصر کے ساتھ ملا ہوا بھی ہوتا ہے مگر اس سے الگ بھی ہوتا ہے بلکہ یہ اختلاط و امتزاج اس انداز کا تھا جیسے شکر پانی میں گھل جایا کرتی ہے۔ یا پھولوں کی خوشبو کی لپٹیں ہوا میں مختلط ہو جاتی ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل جاتی ہیں اور پھر اسی طرح باقی رہتی ہیں۔ وہ مختلط ہو جاتی ہیں اور کسی طرح جدا نہیں ہوتیں۔ یہی حالت ان مختلف ثقافتوں کی تھی۔ اس عہد میں یہ ثقافتیں ایک دوسری کے ساتھ ملیں۔ یہ ان کا ابتدائی اختلاط تھا۔ اور جوں جوں زمانہ گزرتا گیا ان کا یہ اختلاط شدید تر ہوتا چلا گیا اور وہ ایک دوسرے میں گم ہوتی چلی گئیں۔

خریدارانِ طلوعِ اسلام" خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کیجئے۔
(ناظم ادارہ)

طلوعِ اسلام کی پرانی فائلیں برائے فروخت۔ طلوعِ اسلام کی پرانی مجلد فائلیں ۱۹۵۶ء سے لیکر ۱۹۶۱ء تک مسلسل موجود ہیں اصل قیمت پر بکسٹ روانہ کی جا سکتی ہیں۔ خواہشمند حضرات مندرجہ ذیل پتہ لکھیں۔
قمر سلیمی (معرفت) ۵۵ رام تلائی سٹریٹ۔ سیالکوٹ شہر